5/7
25/B

cathy

Cat by

سلسلہ سعیدیہ و رشیدہ نمبر ۲

زندگی

از

ملّا رموزی

زندگی

مجموعۂ نگارشاتِ فکاہی

الملک ملا رموزی، فاضل الٰہیات، ایم، آر، اے، ایس، (لندن)

باہتمام

سید رشید کاظمی

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن

۱۳۵۱ھ

۱۹۳۳ء

Essays — Urdu

بار اوّل ایک ہزار جلد

قیمت فی جلد علاوہ محصول دو روپیہ (عا)

U4
896

ملنے کے پتے

غلام دستگیر صاحب تاجر کتب چار کمان حیدرآباد دکن،

مکتبۂ جامعۂ ملیہ، قرول باغ۔ دہلی،

کتابستان۔ الہ آباد،

حضرتِ مُلّا رموزی بھوپال،

انتساب

میں اس ناچیز مجموعہ کو

ہز اکسی لنسی سر یمین السلطنۃ راجۂ راجگاں مہاراجہ کشن پرشاد بہادر

شاد دام اقبالہٗ

پیشکار و صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

کے نام نامی و اسم گرامی سے

معنون

کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں

ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ملا رموزی

مقدمہ

بخرام و نظر کن کہ بجولانگہِ انشاء
جو برِ قلم زادہ گلستانِ ارم را

جاوید ہمی بخشد و از مایہ نہ کاہید
رشحِ قلمِ ثروتِ اضعافِ امم را

(عرفی شیرازی)

اوس خدا کے نام سے اس مجموعہ کا تعارف لکھتا ہوں جس کی خدائی اور کبریائی کی لاجوابیاں اور بے مثالیاں اربابِ عقل و فراست سے اپنی صداقت و یکتائی کو آج تک منوا رہی ہیں، جو اکیلا ہے مگر کائنات عالم کی ناقابلِ اندازہ مخلوق کے نازک سے نازک وجود کا بھی رازق و حافظ بنا ہوا ہے جس کے بنائے نظام عالم کے اسرار کو نہ حکمائے فرنگ سمجھے نہ عقلائے عالم میں اُس کی ناپیدا کنار وسعتوں کا صحیح اندازہ

ہو سکا۔

اُس خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جس نے عرب کے ایک معصوم انسان کو نبوت و رسالت کی بزرگی عطا فرما کر اُس میں خطاب و کلام کی اور تبلیغ خدا پرستی کی وہ عالمگیر قوۃ پیدا کر دی جس کی الہامی عظمت اور پیغمبرانہ جلالت و رتبت کے آج ساڑھے تیرہ سو برس بعد تک کچھ اوپر چالیس کروڑ مسلمان تو اس طرح معتقد و معترف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوت و فضیلت اُنہیں برگشتہ خیال اور گم کردہ ارادہ نہیں بنا سکتی اور اربوں انسان ایسے ہیں جو اُس کے گرامی مراتب نام کو عزت اور احترام سے لیتے ہیں اور اوسے مافوق الفطرت انسان مانتے ہیں اور جس کا محبوب و پرعظمت نام احمدؐ مصطفےٰ محمدؐ مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

اُسی خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جس نے اُس گرامی جاہ نبی کے اہل بیت اور اولاد میں وہ جلیل العظمت وجود پیدا کئے ہیں جن میں سے ہر ایک نے صداقت اور خدا پرستی کے اعلان و تبلیغ ظالموں سے مظلومین کی نجات و انصاف کے لیئے جنگ و مقابلہ اور انسانی نخوت و کبریائی اور غرور و سرافرازی کی تمام شیطانی قوتوں کو برباد و برہم کرنے کے لیے وہ کوششیں کیں جنکی مثال و نظیر سے انسانیت

کی پرجلال تاریخ یکسر خالی ہے اور خالی رہے گی - اور انہی میں سے ایک ایسا عظیم القدر وجود پیدا کیا جس نے میدان کربلا میں خدائے نے ہمتا کے بنائے ہوئے اصول و ضوابط کی حفاظت و صیانت کو عربی اور فوجی قوتوں کے بل پر توڑ دینے والوں سے وہ خوں ریز اور صبر آزما مقابلہ کیا جس کی شجاعت و ہمت آزمائی کا جواب پیش کرنے سے بہادرانِ عالم کے کلیجے منہ کو آتے ہیں اور جس کا جلالت اندوز نام حسینؑ ابن علیؓ ہے (رحمتہ اللہ علیہ)

اوسی خدا کے نام سے جس نے خلفاء اربعہؓ و صحابۂ رسولؐ کو جہاد و مقابلہ کے ساتھ ساتھ اصول جہانبانی و سیاست آگاہی معارف و حکمت اندوزی اور اخوۃ و برادری کی وہ دلنواز صلاحیتیں اور منفرد زہیں عطا فرمایئں کہ آج بھی کوئی آئے اور اُن کی پیروی کرکے آفتاب شہرت و سربلندی بن جائے اور نہ فقط یہ بلکہ دل چاہتا ہے اور بہ ولائل چاہتا ہے کہ دماغ و قلم کی جتنی مدحت گستر قوتیں حاصل ہوں انہی ناموں کی توصیف و تمجید میں صرف کرتا چلا جاؤں کہ یہی تو وہ ہیں جن کے نتائجِ عمل کے لایزال ولم یزل مدار پر دنیائے انسانیت گردش کرنے پر دیکھ لینا ابدتک مجبور رہے گی۔

رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین۔

اب ان برتراز کائنات نامزں کا غلام مُلّا رموزی اپنی اس مقدرت پر کیوں نہ فخر کرے کہ اُس کے قلم کو خدا نے "نوحۂ زندگی" اور کسی مولوی کے "قیامت نامہ" ہونے سے نہ فقط بچا لیا بلکہ اُس کے قلم کو خدائے عالم آفریں نے حُسنِ قبول سے یوں مزین فرمایا کہ وہ افسانوں کے ستائے ہوئے انسانوں کو غم و افسردگی یاس و نومیدی اور درد و اذیت سے بچا کر سرور و شادمانی مسرت و زندہ دلی کے ولولہ سے معمور کر کے اُنہیں عرصۂ حیات و عمل میں پھر خوش خوش لے آئے۔

اما بعد اس قسم کے قلم و دماغ والے مُلّا رموزی نے جب مشقِ سخن کا سلسلہ شروع کیا تو یہ وہ وقت تھا جب زبان اُردو میں لطیف تحریریں خواجہ غریب نواز کے عرس والے پلاؤ کی طرح "تبرک" سمجھی جاتی تھیں۔ یعنی اردو میں ہنسانے والے کم تھے۔ اور رلانے والے زیادہ اور جو ہنسانے والے تھے بھی تو وہ "قحط الظرفاء" کے باعث خود کو کچھ اس درجہ بھی عالیشان اور عالی مقام بنائے ہوئے تھے کہ اُن کی ایک ایک سطر عوام و خواص میں غفراں مکان حکیم اجمل خاں صاحب کے "مجربات" سمجھے جاتے تھے، اور لوگ ان تحریروں کو اپنے خواجہ حسن نظامی کے تعویذ کی طرح گلے میں لٹکائے پھرتے تھے۔ اب جو اُن کے سامنے چھوٹا سا مُلّا رموزی پیدا ہوا تو آنکھیں کھولتے ہی اُس کے

سامنے وہ افسردہ اور رُلانے والا ماحول تھا جسے سیاسی اصطلاح میں ہنگامۂ دارو گیر کہتے ہیں یعنی جنگ فرنگ پس یہی وہ وقت تھا جب دنیا جرمنی کی ۷۵ میل والی توپ سے خوف زدہ ہو کر کانپ رہی تھی تو ہندوستان کی تحریری دنیا پریس ایکٹ نام کے قانون کے منہ میں تھی اس لیئے محال تھا کہ کام کے آدمی حد ادب سے زیادہ ہمت اور حوصلے سے کام لیتے اس لیئے تاؤ کھا کر ملا رموزی نے بھی گلابی اردو کے نام سے وہ طرز تحریر و خطاب اختیار کیا کہ اچھے اچھے مر گئے مگر نہ سمجھے کہ یہ کیا ہے۔ البتہ سی آئی۔ ڈی والوں کو بتا دیا تھا کہ۔ بھیا گھبراؤ نہیں یہ ایک میرا سیاسی مشن ہے تاکہ مصائب زدہ ارباب کار کو ہمت ہو اور انھیں رونے کا خیال نہ آسکے۔

اب وہ زمانہ بھی گذر گیا۔ جنگ فرنگ کی بلا بھی یہ کہکر ٹل ٹلا گئی کہ ہر گیارہ نومبر کو دو منٹ تک گول رہا کرنا ورنہ پھر لوٹ آؤنگی اس لیے اب وقت آیا تھا کہ کچھ کرتے کہ ناگاہ وہ "بقاء خلافت" ایسا مقدس و محترم معرکہ شروع ہو گیا۔ لہذا اب مُلّا رموزی پھر گلابی اُردو اور کچھ کچھ غیر گلابی اردو بنا رہا تھا کہ ارباب عمل پڑھتے چلے جائیں اور رونے کا خیال و تصور بھی نہ کریں۔

اب یہ دور بھی گذر گیا اور اب ہندوستانیوں کے لیے

کوئی خاص کام نہ رہا تو وہ باہمی ہاتھا پائی پر اُتر آئے یعنی دہلی

کے بنی محمد علی شوکت علی بولے کہ جتنا زور باقی ہے

اوسے جزیرۃ العرب کی حفاظت پر صرف کر دو۔ بمبئی کے بنی

خُجند اور بریلی کے بنی رضا خاں کہتے تھے کہ دماغ و قلم کی ہر قوۃ قبول

اور قبروں کی حفاظت پر یوں صرف ہو کہ قبے رہ جائیں اور عرب کے

بے شمار مسلمان فنا ہو جائیں۔ ہندوؤں کے بنی اسرائیل کہتے تھے

کہ سب چھوڑ دو اور صرف انگریز بھائیوں کا مارے طمانچوں کے منہ

لال کر کے کہو کہ ہندوستان ہندوستانیوں کو دیدو، مگر قادیان اور

پنجاب کے تمام قبائل اس امر پہ متفق تھے کہ انگریزوں کو خراج دیے

جاؤ اور فدوی بنے رہو۔

ابھی یہ ہو رہا تھا کہ لندن سے آئے مسٹر مانٹیگو۔ اور دہلی سے

اوٹھے لارڈ چیمسفورڈ اور کہا کہ یہ بھی جانے دو اور ہمارے کہنے سے

آپ ۳۵ کروڑ ہندوستانی دس برس تک اپنا نام "اسمبلی"

اور "لیجس لیٹو کونسل" رکھکر دیکھو پھر کیا ہوتا ہے، ؟ مگر گاندہی صاحب

سے نبی کھدر اور نبی چرخہ بولے کہ جو کونسل میں جائے اُس کا پانی بند

اب جو ملا رموزی نے ہندوستانیوں کی یہ باہم آویزی دیکھی

تو اُس غریب نے سب کچھ چھوڑ کر ہندوستانیوں کا "ہوم ڈپارٹمنٹ"

سنبھال لیا اور طے کر لیا کہ ان غلامی کے مارے ہوؤں اور غلط تعلیم وتربیت کے ستائے ہوؤں کی اخلاقی اور داخلی اصلاح جب تک نہ ہوگی ان کے فرشتے بھی دنیا میں کامیاب نہ ہوں گے اس لیے اب اس نے خطاب و کلام کا وہ طرز اختیار کیا جسے سلیس اور مروجہ اردو کہتے ہیں۔ پس اس طرز کا پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ اب ملا رموزی کی بات کو وہ گورنمنٹیے" بھی سمجھنے لگے جو انگریزی تعلیم کی وجہ سے گلابی اردو کی عربی فارسی مصطلحات کو اپنے والدین تک سے دریافت کرتے تھے مگر نہیں سمجھتے تھے کیونکہ آج کل کے والد صاحب صرف انگریزیے ہوتے ہیں عربیے اور سنسکرتیے نہیں اور دہلی کے ایک جلسے میں تو یہ اعلان بھی ہو گیا ہے کہ اب والدائیں بھی انگریزی میں تیار ہوا کریں گی، پس اب جو اس طرز تحریر کو اختیار کیا تو ہندوستانیوں کی اخلاقی اجتماعی اور داخلی زندگی کے جو عجب عجب تجربے اُسے حاصل ہوئے اُن میں سے اکثر تو مضامین رموزی کے نام سے شائع ہو چکے۔ البتہ ایک خاص تجربہ آج سُن لیجیے۔

یعنی ہندوستانی غلامی کے جس شدید اور طویل دباؤ میں سے ہیں اُس نے نہ فقط اُن کے لباس، زبان، رسوم، مذہب

اور عام حالات کو کچھ سے کچھ بنا کر رکھ دیا، بلکہ اُن کے دماغ و شعور کی قوتوں کو بھی روندہ ڈالا اور اب وہ ہر اوندھے کو سیدھا اور ہر سیدھے کو اوندھا سمجھنا ہی دلیل ہوشمندی قرار دینے لگے اور کسی ایک جگہ نہ شرمائے چنانچہ ہر قوم اور جماعت کے آداب زندگی اور اصول حیاۃ میں دماغی اور عملی تفریح و زندہ دلی۔ خوش دلی و خوش باشی مزاح و ظرافت از بسکہ حصۂ زندگی قرار دیا گیا ہے لیکن ہندوستانی عقلاؤ علما جو اوٹھے تو اُنہوں نے ان تمام باتوں کو حرام۔ چھچھوراپن، ہزل و بیہودگی بے تمیزی، اور لونڈاپن ثابت کرکے رکھدیا۔ چنانچہ اوٹھا لو لکھنؤ کے منشی نولکشور صاحب کی چھاپی ہوئی کتابیں ہر جگہ یہی لکھا ہوگا کہ ہنسی مذاق اور ظرافت کی باتوں سے آدمی کا وقار ضائع و زائل ہوتا ہے۔ لہذا اب جو عالم و واعظ اُٹھا اُس نے خشک منہ بنا کر رونا شروع کر دیا، جاہلوں نے جو دیکھا کہ عالم صاحب کھڑے رو رہے ہیں تو اُن کے ہاں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے کی کونسی کمی تھی اس لیے آن کی آن میں لکھنؤ سے تا بہ دہلی سیکڑوں ماتم خانے تیار ہو گئے اور آخر کار نا دُکھا کر مولنیا حسرت موہانی بی اے کو کہنا ہی پڑا کہ :۔

غزل کا نام ہزل رکھدیا ہزل کا غزل
جو چاہے آپ کا علم وقار ساز کرے

چنانچہ صوبجات متحدہ اور دہلی کے ارباب قلم کے خشکی اور افسردگی۔ سوگواری اور آہ وگریہ انگجزی پہ اردو میں جو ذخیرہ جمع کیا ہے شاید ہی کسی دوسرے صوبہ کو یہہ ماتمی سعادت حاصل ہوئی ہو اور تو اور وہ اردو کے خدائے سخن اور رجز نگاری کے اوستاذ الاساتذہ حضرتِ گرامی انیسؔ مغفور کے تیغ آزما اور صعف شکن مضامین کو یاروں نے بگومتی ہیں ڈوبا کر صرف اتنے حصہ کا نام مرثیہ رکھ لیا کہ ؎

ہائے مرے ہائے مرے

غرض اودہ سے لیکر دہلی تک جدہر دیکھیئے مرثیئے کے مرثیئے ہیں کہ چھپ رہے ہیں اور بک رہے ہیں۔ یہی حال دہلی میں "نوحہ زندگی" اور "یتیموں کی آہ" کا ہوا کہ جس طرف جایئے ایک آدھ بیوہ یا ایک آدھ یتیم کتب فروش کے ہاں کتاب بنا ہوا بیٹھا نظر آجائے گا۔

کچھ شک نہیں کہ یہہ ذخیرہ تحریر اسلامی سلطنت کے ہندوستان سے مٹ جانے کا وہ افسردہ کن ردعمل تھا جس نے

اُس وقت کے عیش پسند دماغوں کو اپنے عیش و عروج کو یاد دلا کر متاثر بلکہ ماؤف بنا دیا۔ انگریز بھائیوں نے چھ سات ہزار میل دور سے آ کر جس دلیری اور حوصلے سے ہندوستانیوں کے لٹھ رسید کیا تھا اُس کے جواب کے تصور تک سے بھائیوں کو کھانسی کی شکایت ہو جاتی تھی اس لیے اب یہی رہ گیا تھا کہ عہدِ رفتہ کی یاد میں سوگواری اور غم و افسردگی کے مراد آبادی لوٹے بن کر بیٹھ گئے، جنھیں وضو کے لیے نمازی ہی اُٹھا کر اِدھر سے اُدھر رکھ دیں باقی سب خیریت، مگر کسی کو ہوش نہ آیا کہ میدانِ مقابلہ میں شکست کھائی ہوئی قوم کو مرثیوں۔ نوحوں " اور فریادوں سے دور رکھ کر اُس کے اندر جوش و خروش مسرت و خوش دلی اور تفریح و تفنن کے ولولوں کو پیدا کر دینا ہی اُس کی بہی بہی زندگی کا سہارا ہو سکتا ہے، مگر ہوا یہ کہ یاروں نے اسی ماتمی خطاب و کلام کو ادب اُردو کا حصہ قرار دیکر جو فروغ دینا شروع کیا تو خدا کی پناہ یہاں تک کہ چند بالکل ہی عجیب و غریب "خشکوں" نے اس حصۂ تحریر و کلام میں ایک نہایت ہی اچھوتی ترکیب ایسی ایجاد کی کہ زبان اعتراض و طعن ہی گنگ ہو کر رہ جائے یعنی یہ ایجاد ہے نظم اردو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

مخاطب ہو کر قوم کے لیے فریاد کرنا اور آنسو بہانا اور اس حصۂ شعر کا نام کسی نے "سلام" رکھا تو کسی نے مناجات۔ چنانچہ اس قسم کے ماتم گساروں سے آج علم و ترقی کا یہہ زمانہ بھی محفوظ نہیں جیساکہ ذیل کے تازہ نمونوں سے ظاہر ہے۔ مثلاً یو پی کے ایک سیماب صاحب ایسے شاعر ہیں جو شعر گوئی۔ اصلاح شعری و اصلاح شاعری۔ اوستادی۔ اخبار نویسی۔ غرض قیادت و رہنمائی کی ہر عزت و عظمت کو اپنے اسم شریف کے ساتھ لگتا ہوا پا کر بہت مسرور ہوتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں موت نما افسردگی پھیلانے اور رسولِ گرامی جاہ ایسی صاحب علم و وقار ہستی کی جلیل القدر اُمت کو پستی اور خرابی میں پا کر اُسے اُٹھانے اور بڑھانے کا بندوبست نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر سے یوں کراتے ہیں [1]۔

مبارک آپکو یہہ اوج و رفعت کی فراوانی
مبارک آپکو خورشیدِ عظمت کی درخشانی

---

[1] دیکھو اخبار تاج آگرہ مورخہ ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء صفحہ نمبر ۹ کالم نمبر ۱۔

؎ مُسلم بے یار اور بے چارہ ہے
عبرت افروز اُس کا نظارہ ہے
ہے دامنِ مرحمت کا سایہ درکار
کملی والے کی قوم آوارہ ہے

ایک آسمانوں سے اونچے عزت والے نبیؐ اور اُس کی تمام اُمتوں سے بلند مرتبہ امت کی شان میں آخر کا مصرعہ غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ انا للّٰہ

آپ کے بعد یو۔ پی کے ایک نہایت درجہ ممتاز اخبار کے رسولؐ نمبر بابتہ سنہ ۱۹۳۰ء سے ایک نمونہ اور ملاحظہ ہو۔ چوہدری اعجاز حسین صاحب علوی کاکوروی کے رشحات خیال وارادہ ہیں ؎

اے ختم رسل فخر بشر شاہ دو عالم
محبوب خدا زیب دہِ عرش معظم
ہم سے کیا اقبال نے دولت نے کنارا
حکمت نے حکومت نے اور عظمت نے کنارا
عزت نے فتوحات نے جرأت نے کنارا
الطاف و کرم خلق و اخوت نے کنارا
مظلوم ہیں بیکس ہیں زمانے کے ستائے

دشمن نظر آتے ہیں ہیں اپنے پرائے
جینے کہ ستم ہم نے تہ چرخ اُٹھائے
دشمن کو بھی اللہ نہ وہ رنج دکھائے

یہہ وہ حقیر نمونہ ہے جو اس قسم کے ہزاروں اشعار سے لیا گیا ہے جو آئے دن ذی علم سے ذی علم اخبار نویس اپنے صفحات پر شائع فرماتے رہتے ہیں مگر کبھی نہیں سوچتے کہ تم جس عالی مراتب نبی کی شان میں یہ کہہ رہے ہو وہ اوس کی تعلیمات کی نہ فقط خلاف ورزی بلکہ توہین ہے ورنہ بتاؤ کہ کیا پہاڑوں سے اونچے غم والم کے عالم میں بھی رسول اقدس علیہ السلام نے چیخ کر رونا بین کرنا۔ اور ہر وقت آہ وزاری کرنے کو کسی جگہ ضروری جایز اور مفید قرار دیا ہی ؟

آہ! اوس باوقار وصاحب عظمت نبی صلعم نے تو اپنے ہاں کے گنواروں تک کو یوں سنوار اتھا کہ باید وشاید۔ چنانچہ خدا مسرور اور کامیاب رکھے قبلہ اوستاد محترم مولٰنا انوار الحق صاحب بھوپالی کو جنہوں نے عین وقت پر مجھے یہ قطعہ عطا فرمایا۔ سنو ایک عربی گنوار حضور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے انتقال کے موقع پر اون کے صاحبزادے کے پاس جاکر تعزیت کا فرض ان الفاظ میں ادا

کرتا ہے کہ :-

اصبر نکن بک صابرین فانما
صبر الرعیۃ بعد صبر الراس
خیر من العباس اجرک بعدہٗ
واللہ خیر منک للعباس

ترجمہ:- سُنیئے وہ کہتا ہے کہ اے عباس رضی اللہ عنہ کے بیٹے آپ صبر کیجئے تا کہ آپ کے صبر سے ہم صبر کرنا سیکھیں۔ اس لیے کہ رعایا کا صبر اپنے سردار کے صبر سے پیدا ہوتا ہے، عباس کے بعد اون سے بہتر تمہارے صبر کا وہ اجر ہوگا جو خدا تمہیں دیگا۔ اور عباس کے حق میں اب تم سے بہتر اُن کا خدا ہوگا۔

دیکھی آپ نے رسول عرب و عجم صلعم کے غلاموں کی شاعری اور ہمت اور حیات افروز تلقین؟

اس قسم کے شعراء کے بعد اردو میں خشکی اور افسردگی پھیلانے والے چند اسباب اور بھی ہیں جن میں واعظوں کے قیامت ناموں کے ساتھ ساتھ چند پُرانے اساتذہ بھی ہیں جن کے خیال میں تلامذہ

لہ احیا العلوم از امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ۔

کو اوستاد کے سامنے یا اوستاد کے ذریعہ بجز متانت سنجیدگی
عرف افسردگی اور خشکی کے کسی ایسی تحریک۔ تحریر اور گفتگو سے فائدہ
اوٹھانا ممنوع تھا جس سے مزاح و تفریح طبع کا کوئی اثر پیدا ہو۔
اسی لیے دیکھا ہوگا کہ پُرانی درسگاہوں میں داخل ہوتے ہی۔ ایک
نوجوان طالب علم پر بھی عالمانہ قسم کی خشکی نمودار ہو جاتی ہے اور وہ
خواہ مخواہ متانت کے عین تقاف کو بڑے مولویانہ تکلف سے ادا کرتا
نظر آتا ہے۔

خشکی اور افسردگی کو بڑھانے والا اسی قسم کا ایک طبقہ صحافت
اردو میں موجود ہے یعنی حماقت سے یہ سمجھ لیا گیا کہ مزاحی تحریریں بھی
عالمانہ وقار و سنجیدگی کے حق میں مضر ہیں اس لیے بعض رسالوں اور
اخباروں نے ایسی تحریروں سے گریز اختیار کی اور طرفہ یہ کہ عوام
وخواص میں خشک رسالے اور خشک اخبارات ہی صحافت کا بلند
تر معیار قرار پاگئے۔

اس کے بعد اردو میں لطیف تحریروں کی قلت کا سبب لطافت
نگاروں کا وہی قدرتی فقدان ہے جس پر میرا یہ خیال صحیح ہو جاتا ہے
کہ ہندوستانی شاید فطرتاً ہی عبوس و خشک پیدا ہوتے ہیں
ورنہ کیا قیامت ہے کہ اتنی طول طویل اُردو میں۔ اتنے چھوٹے چھوٹے

سے چند طارموزی پیدا ہوئے کہ جب چاہو اُنگلیوں پر گن لو اور بس۔

اس کے بعد اُردو سے امرا اور دولت مندوں کی نفرت اور دوری بھی اُردو میں لطائف نگاروں کی قلت کا باعث ہے اور وہ اس طرح کہ ہندوستان کے امرا اور دولت مند یورپ والوں سے جتنے مرعوب اور متاثر ہوئے ہیں اُس کا جواب نہیں اسی لیے اُن کے ہاں یورپ والوں کے ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی نقل جس قدر جلد کی جاتی ہے کسی دوسرے طبقہ میں نہیں اور کیا یہ اس مرعوبیت کا زندہ ثبوت نہیں کہ یہ آج بیچارے غیروں کی چیز سے واقف ہیں اور اپنی چیزوں سے یکسر بے خبر اسی لیے یہ جو اخبار"پانیر" اور "ٹائمس" کے خریدار ہوئے تو اپنی مادری زبان کے اخبار"سیدار" اور "انقلاب" کو کنجڑوں اور تانگے والوں نے خریدنا شروع کر دیا اور اسی حالت میں اُردو کی ہر چیز قدر افزائی اور حوصلہ افزائی سے محروم ہو کر افسردہ ہو گئی اور کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اردو کے متعدد لطافت نگار کسب معاش کی دماغ سوز تکالیف اور پابندیوں میں مبتلا ہو کر اس دنیا ہی سے علیحدہ ہو گئے اور اُردو اُن کے جواہر افکار سے کوئی حصہ حاصل نہ کر سکی

خود صحافت اردو امرا اور دولت مندوں کی اس بے خبری سے
آج ہو رہی ہے۔ کیونکہ غیر کی حکومت ہونے پر اپنی ہر قومی اور ملکی
چیز کی زندگی امراء وطن ہی کی سرپرستی کی محتاج تھی لیکن جب ان کے
مطالعہ کے لیے پانیر آنے لگا تو اب یہ اردو کے ایک ملّا رموزی
سے بھی واقف نہیں۔ نہ ایک اخبار کے یہ سرپرست اسی لیے خود
صحافت اردو اپنے لطافت نگاروں کی امداد حوصلہ افزائی سے
قاصر رہی۔

امراء وطن کی اپنی ملکی و قومی اور مادری زبان سے اسی بے وفائی
اور غداری ہی نے اردو کی انجمنوں اور اصحاب تصنیف و عمل کو مضمحل
بنا دیا ورنہ اگر غیر ملکی حکومت اردو کی سرپرست نہ تھی تو امداد ملنے پر یہ
اردو کے مولوی عبدالحق اور مولوی سید سلیمان ندوی ہی وہ تھے کہ
اچھے اچھے انگریزوں سے اردو ہی میں نام لکھوا کر چھوڑتے۔ مگر ذرا
دیکھیے امراءِ ہند کی اس روشن خیالی کی کہ وہ لندن ٹائمز سے اپنی
چسپیدگی ہی کو ترقی سمجھے بیٹھے ہیں اور انہیں خبر نہیں کہ اردو میں ملّا
رموزی کسی لطافت نگار کا نام ہے۔ یا اس نام کا کوئی بادشاہ
گذرا ہے؟

تو اب گویا اردو کی حیات و موت کا معاملہ صرف ان لوگوں کے

ہاتھ میں رہا جنہیں عوام یا غربا کہتے ہیں۔ لہذا علمی نقطۂ نظر سے ان
بے چاروں میں وہ ابتدائی چیز ہی "نداردو" ہے جسے لیاقت
یا صلاحیت کہتے ہیں۔ پھر اُس پہ طرفہ مصیبت فطری بدمذاقی،
لہذا اب جو اردو میں بدتمیزیوں، اور بے وقوفیوں کا سیلاب
آیا ہے تو بیچارے انگریز بند باندھتے باندھتے تھک ہی گئے مگر
یہ بدمذاقی ہے کہ اُردو میں موج اندر موج بڑھتی چلی آتی ہے۔ چنانچہ
دور نہ جائیے آج کل ہی کے اخبارات اور رسالے اُٹھا کر دیکھ لیجیے،
کہ ان میں کیسی کیسی لطافت نگاریاں شائع ہوتی چلی جا رہی ہیں۔
پھر داد دیجیے کہ چھاپنے والے دوسرے چھاپنے والوں پہ تو اعتراض
فرماتے ہیں کہ تو اخبار والا نہایت بازاری ظرافت کو شائع کرتا ہے
مگر خود نہیں دیکھتا کہ میں اخبار والا" خود کتنی ذلیل ظرافت کو شائع
کر رہا ہوں۔

اب ان شائع کرنے والوں کے بعد ان کے خریداروں کی
خوش مذاقی تو کچھ اتنی بھی اچھوتی دولت ہے کہ مل جائے تو ذی علم
انسان مارے وحشت کے کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف بھاگتا نظر
آئے لہذا ان خریداروں میں لطافت نگاروں کے لیے کوئی معیار

ہے نہ امتیاز اس لیے انہیں ملا رموزی کی تحریر پڑھکر سناؤ تو یہ مارے ہنسی کے بے خود ہو جائیں گے اور ایک انگریزی کی انمل بے جوڑ تحریر سناؤ تو یہ اوتنے ہی زور سے قہقہہ فرمانے لگیں گے۔ یا پھر یہ ہو گا کہ نہ ملا رموزی کی تحریر سے خوش نہ مولانا سالک کے افکار و حوادث سے مسرور اب فرمائیے کہ ایسوں کو میں مرثیہ میر انیس نہ کہوں تو خوش مذاق کس طرح کہدوں ؟

ان کے بعد اردو میں لطیف تحریروں کی قلت کا باعث خود اردو کی اہل قلم برادری ہے یعنی اس برادری کا دیگر احوال ہی سب سے جدا ہے، مثلاً اس کے ہاں بھی ہندو مسلم فرقہ پسندی کی ایک شاخ موجود ہے یعنی جو جماعت ملا رموزی کی تحریر کو پسند کرتی ہے وہ قیامت تک مولانا سالک کی تحریر کو آگے نہ بڑھنے دیگی اور جو سالک کی تحریر کی عاشق ہے وہ ملا رموزی کی تحریر کو ذلیل ثابت کرنے پر تلی رہیگی چنانچہ اس امر کا ثبوت وہ مضامین ہیں جو ایک دوسرے کے مضامین کو حقیر و ذلیل ثابت کرنے کے لیئے اخباروں اور رسالوں میں آئے دن تنقید اور ریویو کے نام سے شائع ہو کر لکھنے والوں کے دل جلاتے رہتے ہیں جس کے یہ معنے ہیں کہ معترضین کے ہاں اصل تحریر سے بحث نہیں بلکہ جانب داری اور لکھنے والے آدمی سے بحث ہے

ہتی ہے پھر وہ بھی اس صلاحیت اور شائستگی کے ساتھ کہ اگر اُس طرف سے لکھا گیا کہ ابے تو کیا جانتا ہے تو وہ جواب تنقید ہی نہیں جس میں اس طرف سے یہ نہ کہا جائے کہ اب تیرا باوا کیا جانتا تھا جو تو مجھ سے سوال کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اب اردو میں لطیف تحریروں کے فقدان کا سب سے آخری سبب خود اصل لطافت نگار ہیں۔ یعنی اُن کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ بے غیرت ہی ہیں جو ہنسا کر دل و دماغ کی مردہ قوتوں کو بیدار کرتے رہتے ہیں، ورنہ خود ان کے حق میں ان کا ماحول اور اُن کا خاندان ہی وہ مصیبت ہوا کرتا ہے کہ جس کے اندر سے سو ماتم خانے تو پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ مگر ہنسی کی ایک آواز پیدا نہیں ہو سکتی مگر پھر ہیں کہ لطیف تحریر لکھنے پر مرے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک لطافت نگار اور ہنسا کر بے خود بنا دینے والے کی فراغت اور دماغی مسرت کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب جمع ہو کر زندہ قوم کے زندہ دل چارلی چیپلن کے پاس تو چلی گئی ہیں۔ مگر اردو کے کسی ظرافت نگار کے ہاں نہیں۔

اماں وہ اور تو سب کچھ جانے دیجئے میرے خیال میں اردو کے ایک ایک ظرافت نگار کی بیوی ہی کے۔ لیئے خبر منگا لیجیئے کہ وہ

اپنے خوش دل و خوش دماغ شوہر کے حق میں سکون و مسرت
کا باعث ہوتی ہے یا مصیبت و بد مذاقی کا پہاڑ؟ چنانچہ قسم لے
لیجیے جو اردو کے ایک لطافت نگار کے خاندان میں پورا
کا پورا خاندان اُس کی لطافت و ظرافت کا یکساں قدر شناس
ہو بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ہر خاندان میں اُسی کو خوش دل اور لطافت
نگار مانا جاتا ہے جو کہیں کا افسر ہو اور ایک کوٹھی اور موٹر کا مالک
ہو ان خاندانوں میں آپ ظرافت و زندہ دلی کے آسمانی نکتے
ہی کیوں نہ بیان فرما دیجیے کوئی کان بھی نہ دھرے گا۔ لیکن اگر
آپ غلامی کے غلام عرف ملازمت پیشہ بنکر کسی دفتر کے افسر ہو کر
موٹر میں بیٹھکر گھر میں آ گئے تو سارا خاندان ہے کہ آپ کی
لیاقت کا قائل بنا ہوا آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ یہی تو راز ہے
کہ ملا رموزی ہیں اور اُن کے ننھے میاں کی والدہ ہیں اُسی
وقت مسرت۔ خوش طبعی، زندہ دلی اور ظرافت نظر آتی ہے
جب مُلّا رموزی اُنہیں یقین دلاتا ہے کہ وہ یکم دسمبر ۱۹۳۴ء سے
فلاں محکمہ کا افسر ہو جائیگا اور علاوہ پانچ سو روپیہ تنخواہ کے موٹر
بھی سواری میں ہوگا، پھر بتائیے کہ وہ بدنصیب ظرافت نگار کیا
لکھے گا۔ جس کے گھر کا بچہ بچہ افسری خواہ اور موٹر پرست ہو۔ پس

فہرست مضامین

اس حساب سے اگر آپ اردو کے لطافت نگاروں پر نظر ڈالیئے
تو معلوم ہوگا کہ اردو میں لطیف تحریروں کی قلت کا باعث کیا ہے
اب ان حالات کے بعد بھی اگر ان آنے والے مضامین کے
اندر آپ مصروف ہوکر اپنے رنج وغم یاس و افسردگی کو بھول کر کچھ دیر
لطف حاصل فرمالیں تو یا ہاتھ اُٹھا کر مُلّا رموزی کے لیئے دعائے
مغفرت فرمائیں یا بذریعۂ منی آرڈر کچھ نقد ورنہ زیور ہی سہی۔

ار جنوری ۱۹۳۳ء
بھوپال

مُلّا رموزی

ملا رموزی کی اور تصانیف

عورت ذات ۔ یہ کتاب صرف صنفِ لطیف سے متعلق لکھی گئی ہے اور ہر قسم کی عورت ذات کی نفسیات کو واضح کیا گیا ہے گویا دنیا بھر کے لوگوں کی بیویوں کی ہنستی بولتی تصویر ہے

قیمت ہے ۔

لاٹھی اور بھینس ۔ یہ کتاب اپنے رنگ کی ایک ہی چیز ہے اور اردو ادبیات میں ایک گراں قدر اضافہ ۔ عصہ

دیوان ملا رموزی ۔ ملا رموزی کی نثر تو آپ نے دیکھی اب ذرا ان کی نظم سے بھی لطف اُٹھائیے ۔

سوانح ملا رموزی ۔ اس میں ملا رموزی کی پیدائش سے وفات حسرت آیات کے بعد تک کے تفصیلی حالات ہیں ۔

ضرور ملاحظہ کیجئے

اپنے شہر کے کتب فروشوں سے طلب کیجئے

شفاخانہ

اس کتاب میں ہندوستانی بیماریاں ان کی تفصیل ان کے علاجوں کی، تشریح بیماروں کی حالت انکی ذہنیت۔ تیمارداروں کی تفصیل حکیموں ڈاکٹروں ویدوں کا حال غرض بیمار۔ بیماری، تیماردار، علاج۔ دوا۔ حکیم طبیب سے متعلق کوئی چیز چھوٹی نہیں ہے۔ اتنی دلچسپ کتاب ہے کہ آپ ایک مرتبہ شروع کرکے ختم کئے بغیر نہ چھوڑینگے۔ پریس جاچکی ہے عنقریب بازار میں آجائے گی۔

مسافرخانہ

ریلوے سفر۔ تھرڈ کلاس۔ ناشتہ۔ بستر، ٹکٹ اور قلی کی آفت مسافرۃ وغیرہ ہر ایک موضوع پر مستقل طور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اور ان سب چیزوں کو اس عمدگی اور خوش اسلوبی سے بتایا گیا ہے کہ آپ پڑھتے جائیں اور ہنستے جائیں۔

قیمت عہ

(زیر طبع)

خوش باش دمے کہ زندگانی این است

۳۲

اپنے علیگڈھ کالج کا مشاعرہ

دنیا کے تمام علی گڑھوں میں اپنا کالج والا علی گڑھ بھی غنیمت ہے کیونکہ اس کے نام سے مسلمانان ہند میں طب یونانی انگریزی ڈاکٹری بیرسٹری۔ ایڈیٹری۔ لیڈری اور ڈپٹی کلکٹری کے تمام علوم زندہ ہیں صرف فرادینیات کا معاملہ زیر غور رہتا ہے اور علوم و معاشرت تمدنی کی یہ آئی علی گڑھیانہ مستعدی کا حاصل ہے کہ یہاں ہر سال ایک آل انڈیا مشاعرہ زبان اردو کی اصلاح و ترقی کی اغراض سے منعقد کیا جاتا ہے۔ البتہ ڈاکٹری اور طبی حلقوں میں یہ سوال ہے کہ یہ مشاعرہ آخر شدید جاڑے کے موسم میں کیوں منعقد ہوتا ہے؟ یا یہ کہ جب یہ مشاعرہ ہوتا ہے تو جاڑا شدید کیوں ہو جاتا ہے؟ کالج کے پرنسپل سے لیکر جملہ طلبا اس مشاعرہ کے محرک و موید ہوتے ہیں مگر تائید مزید کے طور پر خدا نے لیشا حسن صنا ہروی کو جب سے اس کالج میں بھیج دیا ہے اُس وقت سے آپ کی

ذات مشاعرہ صفات" سے اس میں اور بھی شرکت پیدا ہو گئی ہے۔

اس مشاعرہ میں ہندوستان کے ہر شہر، ہر ضلع، اور ہر قصبہ سے شعرا تشریف لاتے ہیں اور اس سال اُدبا بھی تشریف لایا کریں گے ارکان مشاعرہ کی طرف سے خواہشمند شعرا کو مصارف سفر بھی دیے جاتے ہیں اور تا یوم قیام چائے اور طعام، بیرونی شعرا کو بشرطیکہ وہ "خوش گلو" ہوں طلبا بھی چائے کی دعوت دیتے ہیں ریلوے اسٹیشن پر عزیز طلبہ اور محترم پروفیسروں کی ایک جماعت استقبال کے لئے بھی موجود رہتی ہے" پھر جب شاعر صاحب قیام گاہ پر پہنچ جاتے ہیں اُس وقت سے واپسی تک ان کے آس پاس ایک جماعت ایسی بھی رہتی ہے جو ان کے ہر فقرہ سبحان اللہ ماشاء اللہ جی بہت اچھا حاضر ہوا۔ سگریٹ تو ملاحظہ فرمائیے، پان ملاحظہ فرمائیے آرام سے بیٹھئے ذرا سو جائیے یہ لیجیے تکیہ، کیا غسل کیجئے گا۔ تو ذرا یونیورسٹی بھی ملاحظہ فرما لیجیے کی وہ خدمت انجام دیتی رہتی ہے جس کا تذکرہ میزبانی کے سلسلہ میں کیا ہی نہیں جاتا حالانکہ یہی وہ سب سے بڑی قربانی ہے جو علی گڑھ کالج کی طرف سے مہمان شعرا کے لئے کی جاتی ہے اور حضرت محترم پرنسپل صاحب کے ایک خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی مہمان بیمار ہو جائے تو اُس کے لئے گل بنفشہ، عناب، تخم خطمی، گاؤزبان

دراب اندر کردہ مالیدہ ہمراہ خمیرہ عنبری بھی بہم پہنچایا جاتا ہے، اور آخر میں ایک فوٹو بھی کھینچ دیتے ہیں اور ان کی غزلوں کو بہ اہتمام مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی ایک کتاب چھاپ دیتے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کی بے شمار مراعات علی گڑھ کالج کی طرف سے اس لیے اور محض اس لیے ہیں کہ ادب اردو یا زبان اردو میں حصہ نظم ترقی پائے اور یہی وہ دیرینہ مراعات و خدمات ہیں علی گڑھ کالج کے ارکان اور طلبہ کی جن کے سایہ میں پل کر ظفر علی خاں، محمد علی جوہر، حسرت موہانی۔ اقبال احمد سہیل اور شوکت علی خاں فانی ایسے سخن سنج و سخن ور جوان ہوئے ہیں۔

علی گڑھ کالج کی ان ادبی خدمات و تحریکات کے سلسلہ میں سنہ ۱۹۲۷ء سے ایک اور لائق تعریف ہستی کا اضافہ ہوا ہے اور وہ شہریار اسلام تاجدار بھوپال نواب محمد حمید اللہ خاں بہادر بی اے علیگ دام اقبالہ کے برادر زادہ عالیجناب نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بالقابہ ہیں جو بہ سلسلۂ تعلیم علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے ہیں۔

ممدوح محترم نے اپنے عالی منزلت خاندان کی اُن علمی ادبی

روایات کو ایک حیاتِ تازہ بخشی ہے جو علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور جن کے سرپرست نواب زادہ ممدوح کے اسلاف ہیں چنانچہ ۱۹۲۸ء ہی سے آپ نے کالج کے اس مشاعرہ میں محض شعری تشویق و تحریص کے لیے ایک گراں قدر "انعام" مقرر فرمایا ہے۔ اس سال آپ کے برادرِ معظم نواب زادہ کپتان محمد سعید الظفر خاں بہادر (بھوپال) اور آپ کے محترم استاد حضرت محمد عبدالمجید صاحب قریشی ایم۔ اے کی طرف قریشی سعید الظفر خاں رائی کے نام سے منسوب ہے اور یہ نواب زادہ گرامی ہی کی ادب نوازی ہے جو ملا رموزی صاحب کا علی گڑھ والوں سے اتحاد واقع ہو گیا۔

۲۸ر نومبر ۱۹۲۸ء بکرمی انفعالی کو حضرت محترم مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی عمید مجلس شرقیہ ادبیہ علی گڑھ کالج کا مطبوعہ گرامی نامہ آہی تو گیا لکھا تھا سالانہ مشاعرہ ہے ضرور آیئے۔ دیکھیے بھول نہ جائیگا باقی سب خیریت ہے۔ خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ السلام علیکم۔ احسن پریزیڈنٹ اورینٹل سوسائٹی انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اس عبارت کا پڑھنا تھا کہ فطری نقادی میں اُبال آہی تو گیا اور کہنی کے سہارے سر کو لگا کر پورے غصہ سے سوچا کہ دیکھیے اس ادبی مجلس کے ادبی اذن میں

جب الملکف صاحب کا پتہ اس قدر دبیز انگریزی زبان میں ہے تو مشاعرہ پھر خالص پانیر اخبار کی عبارت ہی میں ہوگا۔

---- ۵ ----

مگر اسی عبارت سے حضرت مولانا احسن کی مصروفیت کا بھی اندازہ ہوگیا۔ کیونکہ ممدوح مشاعرہ کے سلسلہ میں اکثر شعراء کے پاس "اصالتہً" بھی چلے جایا کرتے ہیں اس لیے مسودہ یقیناً وہ "لڑکوں" کو دے گئے ہوں گے انہوں نے مولانا کا پتہ انگریزی میں لکھدیا اور تار کا پتہ پہلے بھی انگریزی میں ہوا کرتا ہے، خیال ہوا کہ جو بالغ نظر لوگ زبانوں میں غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کے اخذ و نقل اور داخلہ کے ع

قطرہ قطرہ بہم شود دریا

والے راز کو جانتے ہیں وہ مولانا ہی پر اعتراض کریں گے حالانکہ مولانا کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور ہزار بار یہ کام لڑکوں ہی کا ہوگا؟

---- ۶ ----

اب وہ جو کہا ہے کہ

اہلِ قلم کا راہوئے بس است

ہم پہنچ گئے اور مشاعرہ سے ایک دن قبل پہنچ گئے کہیے کیا بڑے پہنچے حضرت گرامی نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر، با تقاضیہ میزبان

تھے، پھر کیا تھا مُلّا صاحب کو کچھ غرور ہی ہوگیا ہوگا کہ مشاعرہ کے چند گھنٹے پہلے ہی سے خواجہ میر "درد" کا اثر محسوس ہوا اور پھر خوب محسوس ہوا۔ پھر بخار آیا اور خوب آیا۔ پھر استفراغ ہوئے اور خوب ہوئے پھر ضعف طاری ہوگیا اور خوب ہوگیا۔ اس حالت میں دو سوال سامنے تھے ایک یہ کہ مشاعرہ میں جاؤ مگر نہ جاؤ، دوسرا یہ کہ وطن واپس چلو مگر نہ چلو، لہذا اس چلو اور نہ چلو سے یہ منطقی نتیجہ نکلا کہ نہ چلو تو کہیں نہ چلو اور جو چلو تو دونوں جگہ چلو

حضرت گرامی محمد عبدالمجید صاحب قریشی ایم اے، پرنسپل کالج نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ آپ کو اور حضرت پروفیسر محمد فاروق ایم ایس سی کو مشاعرہ میں "تقریرنا" ہوگا اور یہ خبر بعض لوگوں تک "شدہ شدہ" بھی ہوگئی تھی اس لیئے ایسے لوگوں کو مشاعرہ میں انتظار ہوگا کہ آخر ملا رموزی صاحب مشاعرہ میں ایسے وہ کہاں کے علمی و ادبی دریا بہاتے ہیں جو ہم نے آج تک نہیں دیکھے؟ مگر یہاں ضعف سے یہ حال کہ ایک "باسی کمبل" اوڑھکر مشاعرہ میں یوں چلے جیسے گورنری کے عہدہ سے کمشنری کا چارج لینے چار و ناچار جا رہے ہوں مشاعرہ منعقد ہوا گھر نام آج تک "یونی ین" ہی ہے اور ایک اسی پر کیا موقوف ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کی بے شمار عمارتوں کے نام انگریزوں کے نام پر ہیں خیر

ذرا سوراج مل جلانے دیجئے پھر اگر انہیں عمارتوں کا نام "حویلی سید احمد خاں" "احاطہ محسن الملک" اور "باڑہ مزمل اللہ خان" نہ رکھ دیں تو ملا رموزی نہیں

غرض اس مکان میں نشستوں کا جغرافیہ نہایت درجہ مرتب و مہذب ہے اور ان کرسیوں کو دیکھ کر اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس سال کی کلکتہ کانگریس کے پنڈال کی طرح یہاں ——— امان میری تیری دائی تو چھوڑ دا ذرا ادھر کو ہٹو۔

ارے ارے میرے پاؤں پہ رہتا تو دھرو اکا شور نہ ہوگا مگر ہوتا ہے۔

ان کرسیوں کے درمیان سے ایک ایسا "خطِ مستقیم والا معاملہ" ہے۔ کہ اگر اسٹیج کے زینہ پر منتظم پروفیسروں کا اُتار چڑھا نہ ہو تو شاعر سیدھا اسٹیج پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔ تہذیب محفل یہ ہے کہ اگر کوئی نامی گرامی شاعر یا مہمان داخل ہو تو "تمام کھچا، کھچ حاضرین" تالیاں بجاتے ہیں جو پرجوش خیر مقدم کا مغربی طریقہ ہے اور اب مشرقی بھی۔

ہم جو داخل ہوئے تو ادھے ہال تک کسی کو ضرورت بھی نہیں تھی کہ سب کچھ چھوڑ کر وہ ہمیں پہچان ہی لے اور خود ہم نے دروازہ ہی سے چلا کر کہیں کہ ہوشیار ہو جاؤ جاگتے رہو کہ فاروق صاحب پسند نہ کیا کہ ہم

آ رہے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ آدھے ہال تک یوں گردن جھکائے چلے گئے گویا ہم کوئی چیز ہی نہیں، مگر نصف ہال کے بعد چند طلبہ نے پہچان لیا تو انھوں نے تالی بجا دی، طلبا میں کالج کی طرف سے یوں تو تالی بجانے کے تمام قواعد وضوابط جاری ہیں۔ مگر عمل کے وقت ہال میں صرف ایک تالی بجانا کافی ہوتا ہے۔ پھر برقی رفتار سے جملہ تالیاں بج جاتی ہیں۔ یوں کہ خود تالی بجانے والوں کو تالی کا سبب معلوم نہیں ہوتا اور اسی لیے بعد ختم تالی گردنیں اٹھا کر اور کہنی مار کر ایک دوسرے سے سبب دریافت کرتے ہیں، مگر تالی بجاتے وقت یہ تحقیق نہیں فرماتے کہ آخر تالی کیوں بجی؟ اور جو بجی تو بجے مگر ہم کیوں بجائیں؟ اس لئے ہم نے بھی ان تالیوں کے دو معنی سمجھے ایک یہ کہ یا تو ہمارے آنے سے طلبا کو بے حد مسرت ہوئی؟ یا پھر ہم سے داخلے کے وقت ضرور کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اس لیے ان تالیوں کے صاف معنی یہ ہیں کہ "واہ مُلّا رموزی صاحب"!۔

"اسٹیج" کے قریب پہنچنے میں کوئی قدم دو قدم منٹ باقی تھے کہ کسی نے ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

جلیل احمد

کہا اور ہم اسٹیج سے پہلے ہی بٹھا لیے گئے۔ دیکھا تو برادر محترم حضرت

قدوائی بی اے مشہور ادیب و فسانہ نگار اور حضرت محترم پروفیسر محمد فاروق
ایم ایس سی تھے، گویا تھیٹر کے حساب سے اس وقت ہم پانچ روپیہ والے
درجہ میں بیٹھ گئے مگر فوراً ہی اسٹیج پر کسی نے حضرت عالی پرنسپل صاحب
سے کہہ دیا کہ —— دیکھئے وہ ہاں ہاں وہ ارے صاحب یہ کیا فاروق
صاحب کے برابر بیٹھے ہیں۔ پرنسپل صاحب نے دیکھتے ہی اشارہ فرمایا اور
حضرت قبلہ احسن صاحب دوڑے ہوئے آئے اور ازراہ عنایت شفقت
ہمارے مصافحہ کو بوسہ دیا اور اسٹیج پر لے گئے۔

اسٹیج کی پہلی سطر میں دیکھتے کیا ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہیں یعنی ادیب
عالی پروفیسر خاور ہی ایم اے ان کے بعد ذرا ایک دبیز قسم کے پروفیسر صاحب
ایم اے تھے، دوسرے جانب کی پہلی سطر میں حضرت رئیس الاحرار مولانا حسرت
موہانی رونق افروز اور ان کے پاس نا(خدا جانے کیوں) پروفیسر فاروق
ایم ایس سی پہنچ کر بیٹھ بھی چکے تھے۔ فاروق صاحب کے پاس حضرت محترم
میاں محمد شریف صاحب ایم اے پرو وائس چانسلر تشریف فرما تھے ہم روشنی
کی ندامت سے محفوظ رہنے کے لئے صدارت کی کرسی کے پیچھے بیٹھ گئے
اور پروفیسر مولانا احسن صاحب کے صاحبزادے صاحب سے بڑے ذوق
شوق سے باتیں شروع کردیں، برادرم حضرت محمد فاروق چونکہ ایک پختہ کار

اور کہنہ مشق اخبار نویس اور مضمون نگار ہی ہیں ایک دلکش طرز خاص کے مالک بھی ہیں جنھیں اخبارات میں "حاجی بلغ العلے" کے نام سے سب جان جانتے ہیں اور وہ اخبار ہمدرد ایسے وقیع اخبار کے روح رواں بھی رہے ہیں۔ اس لئے ممدوح گرامی اور ہمارے تعلقات میں ایک "اخباری ساز باز" کا ہونا ازبس کہ لازم و لابد تھا لہٰذا ممدوح نے ہمیں اپنے پاس بُلایا اس لئے بھی کہ حضرت پرووائس چانسلر سے تعارف کا احسان بھی دھر دیں گے اور اپنے پاس بٹھا کر تنقیدیں بھی اڑائیں گے یہی ہوا گئے تو آپ نے بڑی لیاقت سے پرووائس چانسلر صاحب سے تعارف کرایا اور تھوڑی دیر میں اندازہ ہوا کہ حضرت پرووائس چانسلر ادب اردو اور شعراء اردو کے ایک نکتہ رس فرد ہیں اور شاعرانہ مذاق نہایت بلند اور مختص ہے، اس حساب سے اس وقت ایک نشست پر ہم تینوں ادبی اتحاد بلوان کا قبضہ تھا۔ پھر مجال تھی جو تنقید، نکتہ چینی، مصرعہ چینی اور پوری غزل چینی سے کوئی شاعر محروم رہ جاتا۔

یہاں سے ایک نظر ہال پر ڈالو تو ارکان مشاعرہ، اساتذہ کرام، اور عزیز طلبہ کی مستعدی اور مشاعرہ کے اہتمام میں اُن کی مصروفیت دیکھ کر اس لئے جی خوش ہوا کہ یہ سب کچھ محض "علم و ادب" کی خدمت کے لئے ہے

بجلی کے رنگ رنگ کے قمقموں سے مشاعرہ یا صحن محفل یا در و دیوار محفل جگمگا رہے تھے۔ عزیز طلبار باوجود جارڈ اکالج کی اسلامی وردی پہنے تھے اور محترم پروفیسر لوگ انگریزی سوٹ، محفل کی آرائش سے پتہ چل رہا تھا کہ یہاں بھی قبلہ احسن صاحب کو شعرا نوازی سے بہت کم فرصت ملی، اس لئے "لڑکوں" نے رنگارنگ جھنڈیوں میں بجائے "ہلال" کے "مجیک" کی نشان پیدا کردی اور یہ کسی قصد و ارادے سے نہیں بلکہ اس جوش کے ساتھ کہ ایک ہی جھنڈی میں مختلف رنگ کی پٹیاں لگائیں گے تو زیادہ بھلی معلوم ہوگی مگر یہ بھول گئے کہ جب ایک ہی جھنڈی میں تین چار پٹیاں برابر برابر لگائیں گے تو وہ برطانوی جھنڈی ہو جائے گی۔ اور یہاں آج ضرورت تھی "قومی جھنڈی" کی اور تو کچھ نہیں ڈر فقط یہ تھا کہ کہیں مولانا حسرت موہانی کی نظر نہ پڑ جائے کیونکہ وہی ہیں جو ذرا ایسی باتوں سے ناراض ہو جایا کرتے ہیں اور اسی لئے حضرت قبلہ احسن دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں گے کہ انشاء اللہ زندہ ہوں تو آئندہ سال ہال کو "ہلال ہی ہلال" سے بھر دونگا۔

وقت سے پہلے پہنچے تھے اس لئے شعرا و ادبا کی آمد آمد تھی اشراف شہر اور یونیورسٹی کے ارکان وغیرہ آرہے تھے اس لئے اسٹیج کے منتظم حضرات دربار ہے تھے، وعلیکم السلام، مزاج شریف، یہاں تشریف لائیے کرسی لیجئے، یہاں یہاں

ادھر ادھر، یہ لیجیے کرسی حاضر ہے، ذرا بھی خاموش تو رہو، لاؤ وہ کرسی اِدھر اُٹھا لاؤ، آرام سے تشریف رکھیے، اور آپ اپنی کرسی سیدھی کر لیجیے بس بس ٹھیک ہے، دیکھو بھئی شور تو نہ ہونے دو۔ اِن خدمات کے افسر اعلیٰ ہمارے زندہ دِل و زندہ دماغ دوست اور تاریخ کے لائق احترام عالم حضرت پروفیسر عبد العزیز پوری ایم اے، ایل ایل بی، تھے اسی تشریف لائیے کے سلسلے میں وہ ہمارے پاس بھی تشریف لائے اور بڑے تپاک سے سگریٹ پلایا، ان سے بے تکلف ہونے کے لئے بس یہی کافی تھا کہ ہم اِن کی نظر میں پہلے ہی سے ملا رموزی تھے اور وہ ہمارے خیال میں پوری صاحب،،

کرسیوں اور تشریف لائیے کے بعد پان، سگریٹ، چائے کے انصرام میں تو پوری صاحب کو جو کچھ دخل ہو، لیکن وہ طلبہ کے "دو بندے ماتری نعروں" کی روک تھام میں بہت کافی مستعد تھے اور اس انتظام و بندوبست کے لئے دوسرے پروفیسر صاحبان کا طلبہ کے پاس کھڑا رہنا حقیقت میں کالج کی تہذیبی اور تنظیمی تربیت کو نمایاں کر رہا تھا اور اس سے نہ فقط تنظیمی اور اصلاحی بیداری کا ثبوت مل رہا تھا بلکہ اِن پروفیسروں کا جذبۂ ایثار قومی مجالس کی بزرگ داشت اور ادب اردو کی خدمت کے

وہ شائستہ تقلید و لایق سپاس و توانے ظاہر تھے جن سے ملا رموزی صاحب کا قلب کافی طور پر متاثر رہا۔ خدا ان پاک نفس اور ایثار پیشہ پروفیسروں کی صحت اور تنخواہوں میں اضافہ فرمائیے۔ اب رہے قبلہ احسن صاحب شو ان کا ذہنی اور عملی انہماک اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ شور کی تخفیف کے لئے کرسی پر سے کبھی کبھی ہاتھ تو بلند فرما سکتے تھے مگر وہ یہ نہیں کر سکتے تھے کہ ہال میں پہنچ کر "لڑکو ن" سے کہتے کہ دیکھو بھئی اب تو شور کیا ہے۔ مگر اب نہ کرنا ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

مشاعرہ کی طرح اردو تھی۔ ؎

بیخودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

طرح فارسی تھی۔ ؎

دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

ان کے بعد نظم کے لئے "عزتِ نفس" اور "جذبۂ قومی" کے موضوعات تھے۔ ان موضوعات سے انتخاب کنندہ حضرات اور کالج کے عمائدِ تعلیم کے ذہنی تاثر اور مطمحِ نظر کا جو اندازہ ہو سکتا ہے اس کی بلند پایگی، ضرورت، محل شناسی اور قومی تربیت کی صلاحیت اور بیداری کی داد نہ دینا حقیقت آگاہی سے انکار کرنا ہے۔ ان عنوانات سے پرنسپل اور اساتذۂ کرام کے تعلیمی نصب العین کیلئے

یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان بچوں کی اصلاح و ترقی اور تعلیم و تربیت کے جن مفید و برتر مقاصد کے داعی حضرت سر سید علیہ الرحمہ تھے۔ اُن مقاصد کے امانت دار اس کالج میں آج بھی موجود ہیں اور خدا انھیں تادیر رکھے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ جس قوم اور جماعت میں "عزتِ نفس" کا احساس زندہ باقی ہے وہ زندگی کے اعلیٰ مدارج اور علو و برتری کے ہر شعبے کو استوار و مستحکم رکھنے کے لئے ہمیشہ ساعی و کوشاں رہے گی خواہ وہ شعبہ خیال و قیاس ہو، خواہ تجربہ علم و عمل۔ پھر کسی درسگاہ میں "عزت نفس" کی رُوح کو بیدار رکھنا درسگاہ کے ارکان کی اُس محبت اور خلوصِ نیت کو واضح کرتا ہے۔ جو اُنھیں قوم کے نونہالوں کے ساتھ ہے۔ "جذبہ قومی" کا موضوع بھی بین الاقوامی امتیازات خصوصیات کو محفوظ و مستحکم رکھنے کا ایک ایسا درس ہے۔ جس کے منتخب و مقرر کرنے والوں کی وہ "قومی عصبیت اور قومیت پسندی" ثابت ہے جسے وہ اپنی قوم کے ہر فرد میں پیدا کر دینے کے لئے تیار اور مستعد ہیں پھر جب اِن اہم و اقدم موضوعات کو "محفل مشاعرہ" ایسی عام مجلس میں اظہار خیال کی شرط لازم اور قابل انعام عمل ٹھہرا دیا جائے تو اس سے ارکان دار العلوم کا شکر و احسان مسلمانوں کے لئے بھی عام طور پر لازم ہو جاتا ہے، خواہ اِن مسلمانوں میں ہندوستانی ہوں یا افغانستان کے "دستنواری"

حضرتِ گرامی صدرِ مشاعرہ کی میز کے سیدھے ہاتھ کی طرف تو کرسی
حضرت قبلہ احسن صاحب تھے مگر صدر صاحب سے قریب ضرور تھے آپ سے
متصل "کرسیٔ شاعر" تھی۔ میز کی بائیں سمت ناظم تذکرۂ علمیہ کی کرسی تھی
حضرت قبلہ احسن مدظلہ "برطبعا اللباس" میں "رونق افزا تھے اور شعراء کے
اسمار اور ترتیب کی فہرستیں اس آن بان سے لئے ہوئے تھے گویا "جمعیۃ الاقوام"
کے اجلاس میں آخری دستخطوں کے لئے معاہدہ "لوکارنو" اور معاہدہ "کیلاگ"
ہی پیش کرنے والے ہیں اور اسی لئے آپ کے بائیں ہاتھ پر آپ کے
ایک چھوڑ دو "ڈاکٹر ہری اٹاچی" بھی موجود تھے۔ جب ہال کے تمام حصے کھچا کھچ
پورے ہو گئے تو عالی منزلت صدر مشاعرہ محمد عبدالمجید صاحب قریشی ایم اے
پرنسپل کالج صدارت کی کرسی پر یوں جلوہ فرما ہوئے کہ ہم سے اخلاقاً بھی
یہ نہ کہا کہ "لیجئے ملا صاحب آج آپ ہی صدارت کیجئے"۔ بارے ممدوح گرامی نے
افتتاح کار کے طریق پر اور اسلامی قومیت کے دستور و قاعدہ کے موافق ایما
فرمایا اور ایک خوش آواز طالب علم نے قرآن کریم سے چند آیات تلاوت کیں
اور سارا مجمع دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ یہ وہ موثر نظارہ تھا جو ہماری بدنصیب آنکھوں
کو سال سوا سال ہی میں میسر آتا ہے اس نظارے سے اسلامی قومیت اور
خدائے جلال و جمال کی عظمت و شاہنشاہی کی وہ روح بیدار ہو رہی تھی
جسے مسلمانوں میں دن رات میں پانچ مرتبہ زندہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر ویران

مساجد باقی ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا یہی وہ نظارہ تھا جہاں محبوب طلبہ اور کالج کے معزز محترم ارکان کو دست بستہ اور سر خمیدہ دیکھ کر کہنا پڑتا تھا کہ علی گڑھ والوں میں اب "نیچری لوگ" نہیں رہے چونکہ ملا رموزی صاحب حافظ قرآن بھی ہیں اسلئے وہ تاڑ گئے کہ قاری صاحب نے جلسہ کا اثر قبول کر لیا اور اسی لئے وہ ایک جگہ "غلط پڑھ گئے" جس کے گواہ قبلہ احسن ہیں۔

تلاوت کے بعد کاروائی کا آغاز یوں ہوا کہ بائیں کرسی والے صاحب نے میز پر رکھ کر کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اندازہ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کالج کی مجلس مذاکرہ علمیہ و ادبیہ کی روداد تھی مگر ان پر بھی "جلسہ کا رعب طاری تھا اس لئے ایسی آوازیں پڑھ رہے تھے گویا وہ کاغذات کو نہیں بلکہ کاغذات انہیں پڑھ رہے ہیں اس کے بعد حضرت گرامی صدر مجلس نے تقریر فرمائی۔

واضح ہو کہ پچھلے سال ہم نے صدارت سے متعلق اپنی دو حیرتوں کا اظہار کیا تھا ایک یہ کہ اس خالص "مجلس شعر" کا صدر بھی کوئی سلطان الشعراء ہی ہونا چاہئے تھا حضرت گرامی پرنسپل صاحب صدر کیوں ہوئے؟ دوسرے یہ کہ اس زبان اردو کے مشاعرہ کی افتتاحی تقریر انگریزی زبان میں کیوں ہو؟ اسلئے صاحب صدر نے ابتداء تقریر ہی میں کسی بیرونی سلطان الشعراء کو صدر نہ بنائے جانے کے وہ مقامی وجوہ بیان فرمائے جن کا تعلق کالج اور یونیورسٹی کی انتظامی

روایات سے ہے اور ہمیں اس امر کے اعتراف میں تامل نہیں کہ واقعی یہ صدارت ایک ایسی ہی ذات کو چاہتی ہے جو علاوہ ادبی ذوق کے مقامی نسبتوں کے اقتدار کی بھی مالک ہو لیکن اس موقع پر حضرت احسنؔ نے اپنی کرسی صدارت کی کرسی سے بالکل ملا کر لگانے کی کوئی وجہ بیان نہ فرمائی۔

زبان انگریزی میں تقریر والے معاملہ کا جواب صاحب فضل و کمال صدر نے جس عمل سے دیا وہ یہ کہ آپ نے ساری تقریر اردو ہی میں کی اور ممدوح مکرم کا یہی وہ طرز عمل تھا۔ ہمارے اعتراض کے جواب میں جو سبق تھا ان کے لئے جو "اعتراض و نکتہ چینی" کی جائز تلخی کو برداشت نہیں کر سکتے، مگر ملا رموزی کا دماغ صاحب صدر کی اس فراخ حوصلگی، شرافت نفس، اور اصول نوازی" کے لئے ممنون و ثنا گستر ہے، عالی مرتبت صدر نے پھر "غایت شعر و مشاعرہ" پر جو اہم علمی تبصرہ فرمایا اس سے یہ حیرت انگیز انداز ہوا کہ ممدوح محترم تو خود خاصے "سلطان الشعراء" ہیں پھر محققانہ بلند نظری کے متعلق ممدوح کا یہ حصہ تقریر کس درجہ اہم ہے۔ جو آپ نے طلبا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ...... "ایسے اجتماعات اقوام و ملل کی سیرۃ اور ان کے ذہنی خواص کے مظہر ہوا کرتے ہیں۔"

اب مشاعرہ شروع ہو گیا۔ لیکن مشاعرہ کے "عزبی حالات" سے قبل آپ ذیل کی تشریح ملاحظہ فرمالیجئے تاکہ مشاعرہ دلچسپ صورت میں آپ کے سامنے آجائے، پس جان لیجئے کہ مشاعروں میں حسب ذیل جذبات وخیالات کے لوگ شریک وشامل ہوا کرتے ہیں۔

(۱) محض ہنگامہ پسندی کی عادت سے۔

(۲) کسی مشہور گلانے والے شاعر کا کلام سن کر خوش ہونے کیلئے۔

(۳) محض اس لئے کہ صبح تعطیل ہے چلو مشاعرہ میں دیکھو کیا ہوتا ہے۔

(۴) کسی مخبوط ذہن "نوجوان شاعر" کی زبانی اور جسمانی حرکات کی لغزشیں دیکھ کر اس پر قہقہہ لگانے کے لئے۔

(۵) کسی ظریف شاعر کا کلام سنیں گے اور اس پر خوب ہنسیں گے۔

(۶) عمدہ عمدہ غزلیں مشاعرہ سے لکھ لائیں گے اور پھر اسی شاعر کے انداز میں پڑھتے پھریں گے۔

(۷) غزل بھی سنیں گے اور چائے بسکٹ بھی لیں گے۔

(۸) شاعروں کے لئے پھبتی، آوازے تالیاں اور شور بہم پہنچائینگے۔

"ایسوں" سے مجلسی وقار اور اصول کو صدمہ پہنچتا ہے۔

(۹) اپنے دوست شاعر کی غزل پر داد کے لئے خوب چیخ پکار سے
کام لیں گے اور دوسروں کے لئے چپ رہیں گے۔ اس قسم کے شرکاء
میں بعض خود شاعر کے لائے ہوئے بھی ہوتے ہیں اور بعد مشاعرہ شاعر
اپنی تعریف میں خود کوئی مضمون جوڑ کر کسی "اخباری چھیتھڑے" میں ان کے
نام سے چھپوا دیتا ہے۔ جس کا خلاصہ اس قسم کا ہوتا ہے کہ مگر ہمارے شاعر
صاحب کا کلام کیا تھا۔ خالص الہام تھا۔ آرٹ تھا، اُلقا تھا، معجزہ تھا،
کرامت تھی، بشارت بھی، صنعت و حرفت تھی اور ایک طرح کی زراعت بھی
تھی ایسوں سے شعرا میں رقابت، جانب داری اور کبھی کبھی مشاعرہ ہی میں
"لٹھ بازی" کا میدان بھی گرم ہو جاتا ہے۔

(۱۰) محض شعر اور ذوق شعر کے ساتھ آتے ہیں، متانت و سنجیدگی اور
ضبط و سکون سے پورے مشاعرے میں شریک رہتے ہیں اور چائے
سگریٹ کا شکوہ کئے بغیر اُسی وقار و خموشی سے چلے جاتے ہیں۔ ایسوں سے
مجلسی وقار، اصول، باہمی خوشگواری، ایثار اور حسن خیال کی قوتیں فروغ
پاتی ہیں۔

محترم شعرا میں مشاعرہ کے اندر جس ذوق و ذہن کے حضرات تشریف
لاتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) اور بھی سیدھی داد ملے گی مگر ملیگی تو

(۲) مشاعرہ میں غزل پڑھنے سے مزاجی جھجک دور ہو گی۔

(۳) اساتذہ کا "طرز پڑھ" اور طریق گا" دیکھیں گے پھر خود اُسی طرح پڑھا کریں گے۔ اِس خیال کا شاعر مشاعرہ میں "بہت بے محل کود پڑتا ہے جھینج پڑتا ہے، اِس کے تال سُر میں کہیں ٹھمری اور کہیں "قوالی" کا انداز پیدا ہوتا رہتا ہے، لوگ اُس کی اس حماقت پر مذاق اُڑاتے ہیں تو وہ دانستہ طور پر یہ سمجھتا ہے کہ مجھے داد مل رہی ہے۔

(۴) بعض "شاعرزادے" بھی ہوتے ہیں جنھیں بعض کہنہ مشق شاعر غزل دے کر مشاعرہ میں لاتے ہیں اور اس غزل کی داد سے خود علیحدہ بیٹھے مزے لیتے ہیں، بچوں کو ان کی اہلیت سے بلند غزل پڑھوانے کی جہالت میں بعض متین اور سمجھ دار لوگ بھی مبتلا ہیں اور زبانِ اردو کے مشاعروں میں یہی وہ ذلیل رسم ہے جس کی کھلی ہوئی بے وقوفی سے یہ لوگ نہیں شرماتے صرف "اپنے مولانا احسن قبلہ" ایسے "لڑکوں" پر دل ہی دل میں جلتے رہتے ہیں۔

مذکورہ اقسام کے شعرا جہاں حاضرین کے وقت وخیال کی تباہی کا باعث ہیں وہاں ان کے شعری افکار سے ادب میں نہایت پست اور

ذلیل تاثرات کا بیکار ذخیرہ داخل ہوتا ہے جو کسی متمدن اور شاندار زبان کیلئے نہایت مہلک حصہ ادب ہے۔

(۵) بعض ایک ماہ یا ایک ہفتہ پہلے سے مشاعرہ کے لئے محنت کے ساتھ غزل کہتے ہیں۔ اصلاح لیتے ہیں اُسے خوشخط لکھتے ہیں، کپڑے بدلتے ہیں، سواری خرچ ادا کرتے ہیں۔ چار چھ گھنٹہ تک انتظار کرتے ہیں لیکن غزل پڑھتے وقت یوں انکار کرتے ہیں۔ گویا انھیں مشاعرہ تک کی خبر نہ ہوئی۔ مگر مسلسل اصرار کے بعد وہ پڑھتے ہیں۔ اور غیر طرح تک پڑھ گزرتے ہیں اِس قسم کے شعرا کی حرکات کا اخلاقی اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب میں "لایعنی تکلفات" مضحک عادات، سست کاری اور جہلات پسندی کی ذہنیت رواج پاتی ہے۔ ثبوت یہ کہ سنجیدہ شعر کار بھی اِن کے مصنوعی انکار کی جہالت کو جان بوجھ کر اپنے پیہم اصرار سے ترقی دیتے ہیں ترقی یافتہ قومیں ایسی کھلی ہوئی بیہودگی کو قومی ذلت تصور کرتی ہیں۔

---

(۶) اِس قسم کا شاعر آج کل کے نوجوانوں سے پیدا ہوتا ہے مگر علم، عمر، تجربے، دماغ کی ساخت اور فطرت کے لحاظ سے یہ نہایت مرعوب ہونے والی ذہنیت رکھتا ہے۔ یہ تحقیق، جدت، پرواز اور واقفیت کی مقابل ہر طاقتور اور شاندار تحریک اور کیفیت سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ اسکی

شاعری کا قوام گرد و پیش کے ان تاثرات سے تیار ہوتا ہے جن کی صحیح نوعیت و حقیقت کی تہ تک اس کے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی البتہ وہ ماحول کے سطحی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً اس کے عہد کے افراد کسی عظیم الشان انسان کی مصلحانہ آواز کو اگر "پیغام" کہتے ہیں تو وہ فوراً اپنی نظم کو بھی "پیغام" کہہ دیتا ہے، حالانکہ پیغام کی ذمہ داری حکمت آموزی اور اس کی اثری حیثیت کے ادنیٰ اصول سے بھی اس کا ذہن عاری ہوتا ہے وہ "لفظ آرٹ" کی ترکیبی، اصولی اور معنوی خاصیت سے قطعاً بے خبر ہوتا ہے مگر وہ اپنی نظم کو "آرٹ" بھی کہہ دیتا ہے کسی بعید الفہم ادراک و تحریک کو جس کے اثرات بہت عمیق و بلند ہوں اگر لوگ "الہام" کہدیں تو یہ بھی اپنی نظم کو "الہام" کہنے میں تامل نہیں کرتا، اگر یہ سن لے کہ پریذیڈنٹ ولسن آنجہانی کے اصول چہار وہ گانہ کو سیاسیات میں "شاہ کار" یا ماسٹر پیس" کہتے ہیں تو وہ بھی اپنے ہر شعر کو "شاہ کار" یا "ماسٹر پیس" کہنے میں تامل نہیں کرتا۔

اس قسم کے شعرا کی فکری کوششوں کا تمام زور "پر شوکت الفاظ" مہمل اور ناقابل فہم خرافات اور پیچیدگیوں کو نظم کرنے میں صرف ہوتا ہے اور ایسوں کے کلام سے حاضرین، سامعین اور ناظرین کو وحشت ہنسی یا پھر ان

خرافات میں خواہ مخواہ کے قیاسات دوڑانے کی قوت پیدا ہو کر ضائع ہو جاتی ہے اس قسم کی نظم کو منشا شعر اور اصول شعر سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اور اسی لئے ایسے شعرا اپنی خطابی کامیابی کے لئے "خوش آوازی" اور سطوت انگیز الفاظ کی ہیبت طاری کرتے ہیں اور اس طریق کار سے مخاطب میں معانی و مقاصد کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت پست ہو جاتی ہے اور قوم میں "شاندار لفاظی" کی قوت ترقی پاتی ہے۔

(۷) اس قسم کا شاعر فن شعر اور منشاء شعر کے لئے ایک "درمیانی ورجہ" ہوتا ہے جس کا صحیح نام رکھنا محال ہے اسے اگر مشاعرہ کا باقاعدہ اذن نہ دیجے تو یہ میر مشاعرہ یا منصرم سے کہہ دیتا ہے کہ میں ہر حال میں آؤں گا کیونکہ میں "قومی شاعر" ہوں اس حساب سے ایسے شعرا شاعری کے "سائن کمیشن" ہوئے اور ان کے سامعین "گو بیک"۔ مشاعرہ کو یہ لوگ ادب یا اپنی ذہنی خدمت کا کوئی خاص ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کا پہلا مقصد "ابھرنا" اور "شہرت طلبی" ہوتا ہے اور اسی لئے وہ شعر و خیال کی تزئین سے زیادہ اپنی زیبائش سے ناظرین کو متاثر کرتے ہیں، باوجودیکہ یہ خود کو "قومی شاعر" کہتے ہیں مگر قومی خصائص و قومی شعائر میں سے ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا مثلاً ان کی معاشرتی حالت صحیح نہیں ہوتی وہ ملکی اور قومی لباس کا تاثر پیدا کرنے کے عوض انگریزون کا کوٹ اور پاجامہ پہن کر اس ذہنی اور

خیالی درس گاہ میں یوں نظر آتے ہیں۔ گویا کسی قحط زدہ کاشت کار کی نعش کو مصری آثارِ قدیمہ کی مومیائی سے لیپ دیا ہو۔ یہ اپنے کلام کو مؤثر بنانے کے لئے آنکھ، کان، چہرے، کمر اور ہاتھوں سے ایسی مضحک صورتیں بناتے ہیں جن پر حاضرین و ناظرین میں جوش مسرّت و ولولہ اور فہم و ادراک کی توقع کی جگہ شرم انفعال، ملامت اور نفرت کے ذلیل جذبات بھی بھڑکتے ہیں۔

---

(۸) اس نوع کے شعرا کے پاس علوم و معارف، وسعت خیال و تجربہ و وقار و تحمل، سکون و دبدبہ متانت و سنجیدگی اور خلق و سادگی کے خزانے ہوتے ہیں اور اسی لئے وہ اپنی خطابی اور تاثیری حیثیت میں کوئی صنعت و جدت پیدا کرنے سے بے پرواہ رہتے ہیں، مگر اُن کا ہر مصرع خیال و قیاس تکمیل و تحقیق اور سنجیدگی کے تمام شعری لوازم کا حامل ہوتا ہے۔ وہ اپنے کمال کی پختگی کے اثر سے خود اپنی حیثیت اور قیمت سے بے خبر رہتے ہیں جیسے اپنے مولانا حسرت موہانی اِس مشاعرے میں ہری رنگ کی بیاض پر عینک دھرے یوں بیٹھے ہوئے تھے گویا وہ اپنے ہی دولت خانہ میں آرام فرما رہے ہیں اور یہی وہ اصل شاعر ہیں۔ جو اپنے مخاطب میں شعر کے مقاصد و اثرات کو تازہ کرتے ہیں۔ ایسے شاعر کی

تاثیر کامیابی کی علامت یہ ہے کہ سامع پر شاعر اور شعر کی عظمت سے سکوتِ حیرت اور خموشی کی ایک ہلکی سی تھکن طاری ہو جاتی ہے اِس شاعری سے ادب میں لفظی و معنوی وزن و وقار اور مقاصد کا قابلِ تعریف ذخیرہ جمع ہوتا ہے۔

مذکورہ ذوقیات کے لوگوں کے مجمع کو ملحوظ رکھ کر اب اصل کارروائی ملاحظہ ہو۔ حضرت قبلہ احسن صاحب نے بڑے شاعرانہ دبدبہ سے شعرا کی فہرست صدر صاحب کے سامنے پیش کی۔ اور شعرا نے غزل پڑھنا شروع کیا۔ ابتداء میں کالج کے طلبہ نے غزلیں پڑھیں۔ خیال تھا کہ ابھی طلبہ ہی کا سلسلہ جاری رہے گا کہ یکایک ایک بیرونی شاعر صاحب نے غزل پڑھی۔ بلند و بالا قامت آواز میں وہ "فوجداری بھری ہوئی" کہ طلبہ سہم تو گئے ہوں گے۔ چار پانچ اشعار کے بعد آپ نے پانی طلب کیا۔ دیا گیا تو پیا گیا اور پھر رعد و برق کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عمر ہو گی کوئی ایک پچاس برس کی ہر شعر کی تان پہلے شعر کی تان سے مختلف ہوتی تھی، آپ جب فارغ ہو کر کرسی پر بیٹھے تو دیر تک مسرور آنکھوں سے پاس والوں کو اس لئے دیکھتے رہے کہ "کیوں کیسی لاجواب غزل پڑھی" جو شخص ان کی طرف دیکھتا یہ جھک کر آداب بجا لاتے ہیں۔ اس حرکت سے اندازہ ہوا کہ یہ مسرت

انھیں وطن تک خوش رکھے گی اور ریل کے سفر میں بھی یہ مسافروں سے کہیں گے کہ "تمھیں کیا خبر علی گڑھ میں ایسی غزل پڑھ کر آرہا ہوں کہ آپ بھی سُن لیجیے"۔

آپ کے بعد پھر کالج کے طلبہ نے غزلیں پڑھیں۔ شاعر کیلئے چونکہ ایک کرسی رکھ دی گئی تھی مگر اس پر بیٹھ کر پڑھنا شاعر کی ذہنی حالت پر موقوف تھا۔ چنانچہ اکثر یہی ہوا کہ بیدار مغز طلبا کرسی چھوڑ کر "لیکچر" کے انداز سے غزلیں پڑھنے لگے، یہاں سے پھر وہ مقابلہ شروع ہوگیا جو آج کل شعرا میں عام ہوتا جارہا ہے۔ خرابی ہے تو اس مقابلہ میں بوڑھے شاعروں کی یعنی گا کر پڑھنا اور اس پر ہاتھ ہلانے کا اضافہ طرفہ مصیبت ہے۔ چنانچہ متعدد طلبہ نے گایا۔ اس اثناء میں ایک طالب علم ایسے بھی آئے جنھوں نے گانے کی مشق کئے بغیر گانا شروع کیا۔ تو حاضرین نے بھی زبانی داد کا وہ اضافہ فرمایا کہ غزل سننا محال ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا ایک دوسرے طالب علم نے ان سے غزل لے کر پڑھی۔

ادھر تو غزلوں کا سلسلہ مشاعرہ کا رنگ رفتہ رفتہ جمارہا تھا، اُدھر قبلہ احسن صاحب کے انتظامی ارکان تھے جو "پان پر پان" "سگریٹ پر سگریٹ"

اور "پانی پر پانی" پلائے چلے جا رہے تھے اور پھر یہی نہیں بلکہ ہر شخص کے عین منہ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ اصرار کہ الائچی تو لیجئے۔ تمباکو تو لیجئے، چھالیا بھی لی یا نہیں۔ کیا فرمایا سگریٹ بہت اچھا۔ ذرا آپ کو سگریٹ دیجئے ہاں ہاں آپ کو بھئی ماچس تو دو یہاں حضرت مکرم پروفیسر عبد العزیز پوری سگریٹ پلانے میں اس درجہ مستعد تھے۔ کہ پہلی سگریٹ کا تار نہیں ٹوٹنے دیتے تھے اور احسان مزید یہ کہ منہ کے سامنے کھڑے ہو کر ماچس بھی خود جلاتے تھے جہاں سے سگریٹ ختم ہو جاتے وہاں سے آواز دیتے۔

سگریٹ لانا مگر خود علیحدہ نہ ہوتے اس تواضع کی ترتیب یوں بھی کہ شاعر پوری غزل پڑھ کر بیٹھ بھی جاتا تھا۔ مگر "متواضعین" کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس معاملہ سے شاعروں کے دل میں آگ لگ جاتی تھی مگر یہ تواضع پیشہ حضرات بھی تھے تجربہ کار اس لئے جہاں شاعر غزل پڑھ کر بیٹھتا۔ یہ حضرات پان سگریٹ کے خوان لیکر اُسے پان پیش کرتے اور بے سُنے سمجھے یہ بھی کہتے پان ملاحظہ فرمائیے۔ ماشاء اللہ کیا غزل پڑھی بے چارہ شاعر پان بھی کھاتا اور شکوہ کی بجائے شکریہ پیش کرتا۔

یہ وہ تواضع تھی جس سے حاضرین اور شعرا ناخوش ہوں گے اور دل میں کہتے ہوں گے کہ یہ "عطر پان" غزل کے کسی ایسے خاتمہ پر کیوں

نہیں پیش ہوتے۔ جب سب طرف سکون ہو یا اس کے لئے اعلان کر دیا جائے کہ ”معزز شائقین بعد غزل کے ایک سگریٹ بھی پلایا جائے گا“۔ مگر یہ مسئلہ ہے ارکان مشاعرہ کے خلوص کا اس لئے اُمید نہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی واقع ہو۔ پھر اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ حضرت پروفیسر پوری کبھی کبھی صدر صاحب کے برابر بھی کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہال کی طرف فخر سے دیکھ سکتے ہیں اس حالت میں کوئی اِن سے نہیں کہہ سکتا کہ ”ذرا عمامہ اتار لیجئے شاعر کا منھ نظر نہیں آتا“۔ اسی طرح یہ شاعر کے لئے بھی یوں مفید ہیں۔ کہ شاعر کی نا موجی حرکات حاضرین کو نظر نہیں آتیں تو شور کم ہوتا ہے بہر حال یہ سارا معاملہ حضرت احسن قبلہ کے ذوق پر موقوف ہے مگر وہ اِس وقت حاضرین کی سطروں میں کب تشریف رکھتے ہیں جو انھیں علم ہو۔

چونکہ مشاعرہ ابھی ابھی شروع ہوا تھا، بیرونی شعرا میں سے بہت کم آئے تھے۔ البتہ ہمارے سیدھے ہاتھ والی سطر میں ایک صاحب یوں بیٹھے تھے کہ سر کو کرسی پر لگا کر پاؤں کو اس طرح دراز فرمایا تھا گویا وہ سورۂ یٰسین سننے کے لئے آخری) مرتبہ سخت ہو چکے ہیں۔ مزاجی خشکی کا یہ عالم کہ کسی شاعر کی غزل پسند ہی نہ آتی تھی۔ آنکھیں بند فرما چکے تھے۔ پان۔ سگریٹ والے ان کے اکڑے ہوئے پاؤں پر سے خود ہی کود کر

چلے جاتے تھے۔ مگر وہ بس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ گویا اُن کے لئے یہ مشاعرہ بھی آگرہ کا ریلوے ویٹنگ روم تھا۔ جہاں مسافر کرسی پر نصف بیٹھ کر اور نصف لیٹ کر سو جاتا ہے' ان کے منہ سے جو کسی شاعر کے لئے داد یا تحسین کے الفاظ نہ نکلے سو اس لئے کہ "خود کوئی بہت ہی بڑے ہوں گے"۔

اِن حالات کے بعد ہمارے اوپر پھر خواجہ میرؔ دردؔ کی توجہ ہوئی اور ہم مشاعرہ سے اُٹھ کر صرف ذرا وطن تک چلے آئے۔ چونکہ وطن تک پہنچنے میں ریل گاڑی کے دو دن صرف ہوتے ہیں اس لئے گویا ہم مشاعرہ ہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فرق صرف نظر اور خیال کا تھا اس لئے مشاعرہ کے دوسرے دور میں جو کچھ ہوا خیال و قیاس کی امداد سے وہ بھی قلم بند کئے دیتے ہیں چنانچہ دوسری شب میں یہ ہوا ہو گا کہ ہمارے دیرینہ دوست حضرت مولانا سید کلب احمد مانی جائسی آگئے ہوں گے۔ حضرت مولانا شوکت علی فانی بی اے ایل ایل بی (علیگ) حضرت جگر مراد آبادی' حضرت پنڈت جگ موہن لال انادی۔ رواں ایم اے' ایل ایل بی' حضرت نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بھوپالی' حضرت مولانا اظہر علی آزاد شریک ہوئے ہوں گے۔

جلسہ پھر تلاوتِ قرآنِ پاک سے شروع ہوا ہو گا۔ حضرت محترم صدر نے

بڑے تپاک سے حضرت قبلہ احسن مارہروی سے غزل کے لئے اصرار فرمایا ہو گا مگر قبلہ ممدوح نے کھانسی کا عذر فرما کر غزل سے صاف انکار کر دیا ہو گا۔ اور مشہور یہ ہوا ہو گا کہ چونکہ حضرت مولانا بعض شعرا کے پاس "اضافتہً" بھی گئے تھے اس لئے عدیم الفرصتی کی وجہ سے غزل نہ کہہ سکے آپ کے بعد حضرتِ گرامی میاں حامد علیخاں صاحب (بھوپالی) نے غزل پڑھی ہو گی اور بہت دلنشین انداز میں پڑھی ہو گی۔ اس پر برادر محترم حضرت جلیل احمد قدوانی بی اے نے ہاتھ جوڑ کر صدر صاحب سے کہا ہو گا کہ اس غزل کو دوبارہ پڑھوایا جائے تو بھوپال کے حضرت مولانا حامد سعید خاں صاحب نے اس غزل کو پڑھا ہو گا، پھر صاحب صدر نے بڑے تپاک سے حضرت جگر مراد آبادی سے غزل کے لئے اصرار کیا ہو گا تو طبیعت اچھی نہ ہونیکے باعث انھوں نے دو غزلیں پڑھ کر صاف کہہ دیا ہو گا کہ اب معافی چاہتا ہوں پھر حضرت رواںؔ نے نہیں تو حضرت ماؔنی جائسی نے غالب کی مشہور غزل پر اپنی بہترین تضمین پڑھی ہو گی۔ جس میں یہ بھی آتا ہے کہ "یک قطرہ، خون وہ بھی" انھیں اور حضرت رواںؔ کو بیحد داد ملی ہو گی۔ اس کے بعد صدر صاحب نے حضرتِ گرامی پروفیسر عبدالعزیز صاحب پوری سے فرمایا ہو گا کہ موقع غنیمت ہے۔ غزل پڑھیئے تو ممدوح نے نہایت حال فشانی سے ترنم کے ساتھ غزل پڑھی ہو گی تو لوگ باگ چیخ اٹھے ہوں گے کہ سبحان اللہ اور وہ بھوشل

مشہور ہے کہ "پروفیسر کو دیکھ کر پروفیسر رنگ بدلتا ہے" سو آپ کو دیکھ کر
ایک پروفیسر صاحب نے فارسی غزل شروع فرمائی ہوگی، مگر مارے
ترنم کے دو چار اشعار کے بعد ہی کھانسی نے پکڑ لیا ہوگا، ان کے پڑھنے میں
وقار، دبدبہ، شوکت، ان بان کے تمام لوازم مکمل ہو گئے تو طلبہ مسکرائے ہونگے
مگر پروفیسر ہونے کے ڈر سے وہ مرتب تالیاں نہ بجائی ہوں گی جو وہ کبھی
بے اختیار بجا اٹھتے ہیں۔

آپ کے بعد ایک صاحب سے اور کچھ نہ بن آیا ہو گا تو انہوں نے
صاف صاف غزل پڑھنا شروع کر دیا ہو گا۔ جسے سُن کر حضرت مولانا احسن
آپ سے باہر ہو گئے ہوں گے اور آپ نے شاعر سے کہدیا ہو گا۔ بس بس
بس۔ بعد میں معلوم ہوا ہو گا کہ ان شاعر صاحب کو حضرت ملا رموزی نے
مشاعرہ سے رخصت ہوتے وقت ریلوے اسٹیشن پر مشاعرہ میں جانے کی
تاکید فرما دی تھی اور ان کا تخلص اور کچھ نہیں تو بوم ہے پھر حضرت فانی
مدظلہٗ نے غزل پڑھی ہو گی تو مشاعرہ ان کی عظمت، خوش سلیقگی، حسن اخلاق
اور حسن کلام سے بے انتہا متاثر ہوا ہو گا۔ اِن کے بعد لوگوں کا دل کسی
دوسرے شاعر کا کلام سننے کو نہ چاہتا ہو گا۔ مگر ایک صاحب نے یہ ضرور
کہا ہو گا میں یہاں بھی سناؤں گا اور آپ طلباء کے "گمرد ل پر آگر" بھی

سناؤں گا۔ سنجیدہ حاضرین نے اِس بیچارہ کی پست ذہنیت پر دل میں نفرین کہہ کر بظاہر تبسم فرمایا ہوگا اور بس۔

اب مقام ہردوئی کے گورنمنٹ ہائی اسکول کے ایک ماسٹر صاحب کے کلام کی باری تھی مگر افسوس کہ وہ خود حاضر نہ ہوسکے۔ اِس لئے ممدوح نے اپنا کلام حضرت قبلہ احسنؔ کے نام روانہ کردیا جو "ڈاک خانہ سے سازباز" کی وجہ سے بجائے حضرت احسنؔ کے ہمیں مل گیا۔ اس لئے ہم اُسے "دیکھ کر پڑھتے ہیں"۔

اِس کلام میں عروض، علم الکلام، بلاغت، سیاست، پند و نصیحت، فلسفہ، انشاء وغیرہ وغیرہ کے بیشمار و بے اندازہ اصول شامل ہیں۔ اِس لئے اُن کی تفصیل ایک علٰحدہ تبصرہ کی محتاج ہے۔ جس کا یہ موقع نہیں۔ البتہ ماسٹر صاحب نے مشاعرہ کی طرح میں جو غزل کہی ہے، پھر اسی غزل میں عزت نفس" اور جذبۂ قومی" کے دونوں عنوانوں سے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اُن سے پہلے آپ کو یہ بھی ظاہر کردینا تھا کہ "میں اس وقت کن حالات میں مصروف ہوں۔ اس لئے آپ نے ان تاثرات کو بھی ایک "منظوم خط" کی صورت میں حضرت احسنؔ قبلہ کو روانہ فرمایا۔ مگر یہ منظوم خط اور "غزل عزتِ نفس" اور "جذبہ قومی" کی دو نظمیں کاغذ پر جس طرح لکھی گئی ہیں اُن کے

لحاظ سے بہ یک نظر یہ منظوم خط "غزل" اور طرحی غزل معلوم ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ ماسٹر صاحب کا نام اُن کا نام بھی ہے اور اسی کا ایک حصّہ اُن کے تخلص کا مزا دے جاتا ہے ان کا نام ہے مول چند اور تخلص کا "انجارج" ہے "شرما"

اب آپ نے یوں تو ہزاروں "چند" دیکھے ہوں گے مگر ذرا اپنے ان "مول چند" کو بھی دیکھ ہی لیجئے اور فیصلہ کیجیے کہ شاعری میں "ایسے چند" کو "کیا کہنا چاہئے۔ چنانچہ ممدوحِ مکرم کے "مکتوبِ منظوم" یا "غزل" کا مطلع ملاحظہ ہو، مگر مشاعرہ کی طرح کو پہلے ذہن نشین فرما لیجئے ارشاد ہوتا ہے اور وہ بھی حضرت احسن ایسے ادیب و استادِ فن سے ارشاد ہوتا ہے کہ ؎

مکرم قدرداں، مارہری احسن
ہیں وارے شاعری پہ جو کہ تن من

مشاعرہ کی مقررہ طرح کے بعد اِس مطلع سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت احسن مدظلہ، نے ضرور کوئی "خفیہ طرح" بھی دی تھی جس پر حضرت شرما نے "احسن اور تن من"، کے قوافی سے کام لیا۔

پچھلے سال کی "روداد" اور سفرنامہ میں ہم نے بعض احباب کی

وطنی نسبتوں کو بربنائے تفنن اُن کے ناموں سے پہلے لکھ دیا تھا یا تھا مثلاً "جالندھری حفیظ" اور "مارہروی احسن" ان ترکیبوں کی لطافت سے مرعوب ہو کر ایک تہی مغز اور تہی مایہ "اخبارچی" اپنے ایک انشا پردازانہ ملغوبہ میں ان بزرگوں کے ناموں کو اسی طرح نقل کر کے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ لوگ ان ترکیبوں کو "اخبارچی" کی ذاتی ایجاد سمجھکر بس تڑپ ہی تو جائیں گے لیکن حضرت شرما نے تو متانت واحترام سے حضرت احسن مارہروی "مارہری احسن" نظم فرما دیا پھر طرفہ تماشہ یہ کہ "وزن" کے اعتبار سے مولانا کا نام نامی مع وطنی نسبت کے "رہروی احسن رہ جاتا ہے یقین نہ ہو تو شرما صاحب کا مطلع پھر گنگنا لو۔

اِس مطلع میں اگر ہمیں قبلہ احسن صاحب معاف فرما کر اجازت دیں تو ہم بیشمار رازہائے سربستہ کا انکشاف کیے دیتے ہیں، مثلاً پہلے مصرع میں شرما صاحب نے "مکرم" کے بعد ہی "قدرداں" لکھکر ثابت کر دیا ہے کہ حضرت احسن اور حضرت شرما کے نہ فقط تعلقات ہی "خوشگوار" اور دیرینہ ہیں بلکہ احسن صاحب اس قسم کے شعرا کے قدرداں بھی ہیں اب رہا مصرع ثانی میں یہ لکھنا کہ حضرتِ احسن قبلہ

ہیں وارے شاعری پر جبکہ تن من

سو اس سے انکار نہیں کہ یہ ایک "واقعہ بالکل" ہے۔ (یہ اضافت غصہ اول کی حالت میں جائز ہے۔

آج کل کے انگریزی یافتہ لوگ شعر میں "گل و بلبل" کی جگہ "حقائق و تاثرات" کے بہت شائق، پھر شعر کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ شعر شاعر کے مافی الضمیر کا آئینہ ہو، اس غلطیہ سے مطلع کے بعد شرما صاحب کے حقیقی اور واقعی تاثرات ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں ؎

پریشاں سر ہی آمد انس پکٹر ۔۔۔ ہیں آئے ساتھ وویم ڈائریکٹر

عدیم الفرصتی، کار گراں ہی ۔۔۔ ومیلہ رام لیلا کا مراں ہی

یہ ہیں وہ اشعار جن سے ادبیات اردو میں "وضع الفاظ" مصطلحات اور اختراع و جدت کے ضوابط ترتیب پاتے ہیں، مثلاً انسپکٹر کو "انس پکٹر" کہنا جس قدر آسان ہے اُتنا ہی "پریشان سر" ہے کی بندش کس قدر محال ہے جسے شرما قسم کے شعرا ہی باندھ سکتے ہیں۔

بھاری یا بیشمار کاموں سے عدیم الفرصت رہنے کو دوسرے شعر میں یوں نظم کر دیا کہ

"عدیم الفرصتی کارِ گراں ہے"

خضر ما صاحب کا کام نہیں تو کیا اُستاد غالب کا کام ہے کیوں کہ اُستاد غالب اگر اسے لکھتے تو بس اس طرح کہ

"کار ہائے گراں سے عدیم الفرصت ہوں"

اور بس مگر خضر ما صاحب کی عدیم الفرصتی کا سبب "صرف" کار ہائے گراں تو ہیں نہیں بلکہ اُن کے سامنے اس سے بھی زیادہ اہم مصروفیت کا باعث تو "وصیلہ رام لیلہ کامراں" بھی ہے (واوٗ عاطفہ) کو یوں تو ہم بھی اکثر و بیشتر غلط مواقع پر لکھا کرتے ہیں مگر ہم آج تک اس غلطی میں وہ حسن پیدا نہ کر سکے جو خضر ما صاحب نے "وصیلہ" کہہ کر پیدا کر دیا ہے۔ اب رہا "کامراں ہے" تو یہاں صفت موصوف مبتدا و خبر اور فک اضافت" کے جو بلیغ تواتین صرف کئے گئے ہیں انھیں ہم ابجد خواں طارموزی کیا خاک سمجھ سکتے ہیں! اب کمال قادر الکلامی ملاحظہ ہو۔ اس قدر انہماک پر کہ "ڈش پکچر" اور "ڈوبم ڈاکٹر" کی آمد کے ساتھ ہی "وصیلہ" کامراں ہے کا واقع ہونا لیکن خضر ما صاحب ایسے ہزار داستان کے لئے ایک غزل کا کہہ دینا بات ہی کیا تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

کہی ہے چند منٹوں میں غزل یہ
محض خوشنودیٔ خاطر مسیح یہ

قواعد کے لحاظ سے "یہ" صرف اشارہ ہے اور وہ بھی قریب کے واسطے اس لئے ثابت ہوا کہ یہ غزل حضرت مولانا احسن قبلہ کی شان میں نو نہیں کہی گئی بلکہ شرما صاحب نے اسے محض اپنی خوشنودی خاطر طبع" کے لئے کہی ہے اور وہ بھی "چند منٹوں" میں کہی ہے، اب آگے چل کر ارکانِ مشاعرہ کی اُس "زبردست جدوجہد" کا راز فاش ہوتا ہے جو انھوں نے حضرت شرما کو مشاعرے میں اصالتۃً بلانے کے لئے کی مگر حضرت شرما نے ارکانِ مشاعرہ کی مسلسل التجاؤں اور تقاضوں سے تنگ آکر صاف انکار کر دیا ہے اور وہ بھی "غزل کے ذریعہ" انکار کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ ؎

نہیں ہی دو بدو ہونے کا منشا

نہیں ہے فرصت شرکت پڑھے آ

عروضیوں کے نزدیک "تعقید" ایک نہایت بھونڈا پن ہے اور گو اساتذۂ متقدمین وحال اِس سے بچ نہیں سکے پھر بھی "تعقید" کو شاعر کی "لفظی وخیالی بے بسی" پر محمول کیا جاتا ہے، لیکن حضرت شرما نے "پڑھے آ" کہہ کر ثابت کر دیا ہے کہ ایجاد واختصار کو اس سے زیادہ حسین وجامع بنا دینے کا کوئی دوسرا ذریعہ ہی نہیں جسے اختیار کیا جائے اب رہا "دو بدو ہونے کا منشا" سو خدا ہی نے محفوظ رکھا۔

اب تک نوشہ صاحب نے علی گڑھ کے طلبہ کی عمر، اُن کی ابتدائی تعلیم اور معمولی قسم کی معلومات کے تصور سے نہایت سادہ اور آسان مفہوم اور الفاظ سے کام لیا۔ لیکن آخر کمال علمی اور تبحر کو کہاں تک ضبط فرماتے اس لیے ایک عالمانہ شعر "فرمایا ہے جس میں فارسی مرکب اضافی، شوکت لفظی اور تخیلی نزاکت کے دریا بہائے ہیں اور ملّا رموزی تو ملّا رموزی اُن ایسے اگر ہزار آ جائیں تو آنے والے شعر کی شرح سے عاجز رہیں۔ فرماتے ہیں:-

توقع تو یہ ہو پس اند خاطر
جمع ہوں گے شعرا ہند شاطر

پسند خاطر کی جگہ "پس اند خاطر" شعری "پس ماندوں" کا مخفف بھی ہو اور ضرورت شعری " بھی اب رہی "شعرا ہند شاطر" کی ترکیب سو اس پورے مصرع کو اس سال بی اے، فوسٹ کے امتحان اردو میں دے دیا جائے پھر نہ حضرت حفیظ جالندھری کے بلانے کی ضرورت نہ رہے گی۔ نہ حضرت اصغر گونڈوی کی مگر "توقع تو یہ ہو" کہ ایسا نہ کیا جائے گا۔

شعرا میں یہ نقص بہت عام ہو گیا ہے کہ وہ غزل میں خیریت و عافیت لکھتے نہ ختم غزل پر خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام، پس اس نقص کو شہر ما صاحب نے دور فرما دیا ہے اور و سلام خط وسط غزل میں دور فرما دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

دعا فتح بسمیح تسلیم سرہندی کو
ہو حسبِ حیثیت آداب سب کو

مصرع اولیٰ میں "سرہندی" سے مراد حضرت احسن قبابہ میں اور "دعا فتح تبسیم تسلیم" کی عربی سو آپ اسے دار العلوم دیوبند، تھانہ بھون اور ندوۃ العلما لکھنؤ میں بھیجکر اس کے معنی دریافت فرمائیے سوائے جامعہ از ہر مصر کے اگر کوئی سمجھا دے تو ہمارا ذمہ اور اسی لیے ہمارا مشورہ ہے کہ اب مولانا ابرار حسین صاحب فاروقی کو تو یونیورسٹی کے ٹرسٹیوں میں لے لیا جائے اور عربی کے تمام اسباق حضرت علامہ شرما مولوی فاضل ازہری کے سپرد کر دیئے جائیں

اب شرما صاحب غزل یا خط ختم فرماتے ہیں اور غزل کی تاریخ اور سنہ کو غزل ہی میں نظم فرما کر شعرائے بے تاریخ کو ایک سبق دیتے ہیں، پھر ڈاک خانہ والوں کی مشہور عام چوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں ؂

دسمبر پندرہ ویں سنہ بست و ہشتم
لفافہ میں روانہ کر۔ نہ ہو گم

مصرع اُولیٰ میں حرفِ ربط کی کمی کو فارسی سے پورا کرنا کمال نہیں تو کیا جہالت ہے؟

پھر شعرا اب تک غزل ہی پر ٹکٹ لگا کر مشاعروں میں روانہ

کر دیتے تھے اس لئے آپ نے بتا دیا کہ "لفافہ میں روانہ کر نہ ہو گم"

غالب مرحوم شاعری کے ہزار ابوالآباد تھے مگر اُن کا عجز کچھ کم قابلِ افسوس نہیں کہ وہ بیشمار مواقع پر مقطع میں اپنا تخلص نظم نہ فرما سکے اور غالب کی جگہ "اسد یا "اسد اللہ خاں غالب" لانا پڑا اور اس مثال سے تو ساری شاعری عاری ہے کہ کسی شاعر نے اپنا نام تخلص اور عہدۂ ملازمت تک نظم کر دیا ہو اور وہ بھی صرف ایک مصرع میں، مگر حضرت شرما کی شعر گوئی اور قادر الکلامی کی قوت ملاحظہ ہو کہ ممدوح نے کس درجہ جامع مقطع فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ ؎

مصنف، مولچند، شرما ہیں ٹیچر
چمکتے دہر میں ہیں مثلِ اختر

بے وقوف ہی ہیں وہ یورپ والے جو حضرت شرما کے ہوتے ہوئے بھی دہر میں "مریخ" کی تحقیق میں سرگرداں ہیں۔

اِس کے بعد والے اشعار پر چونکہ خود حضرتِ شرما نے یہ نوٹ لکھ دیا ہے کہ:-

"سامعین صاحبان! اس نظم میں عزتِ نفس اور جذبۂ قومی دونوں ہیں"

اس لئے اوپر کے تمام اشعار کو آپ کی غزل سمجھنا جائز ہوگیا۔ لہذا آپ اوپر کے اشعار میں خدا کے لئے ایک جگہ بتا دیجئے کہ "معشوق عاشق" حسن، عشق، وصل و ہجر، درد، گداز، آہ و نالہ، گل و بلبل، صحرا، ویرانہ لیلیٰ مجنوں، غرض تغزل کا ایک جملہ بھی لایا گیا ہو، مگر اس "بے تغزلی" پر غزل ہو جانا شمسا صاحب کی وہ غزلی فضیلت ہے جس کی وجہ سے آپ

چمکتے دہر میں ہیں مثل اختر

غزل کے بعد آپ کی وہ نظم ہے جس میں "عزت نفس اور جذبۂ قومی" کے حکیمانہ نکات و غوامض کو حل کیا گیا ہے اور چونکہ ملا رموزی بہت معمولی قسم کے لکھے پڑھے آدمی ہیں اس لئے ان اشعار کی شرح سے عاجز آ کر اصل نظم نقل کئے دیتے ہیں، اب اگر کالج کے ارکان میں ذرّہ برابر بھی قابلیت ہے تو وہ اس نظم کو نصاب میں داخل کرلیں گے وہو ہذا

ہندو و مسلم کوئی بھی ہند میں آزاد نہیں
لطف گلشن میں گل و بلبل و شمشاد نہیں

راست گو شیخ کے پیر و نو اطفال بھی
جانتے آپ کیا ہیں قصۂ بغداد نہیں

کام نیکی و سخاوت کے جہاں میں کیجیے
اشرف الخلق یہاں آپ سا ہیں ہمزاد نہیں

اپنے من مانے سبھی کام جہاں میں کرتے
مانتے بات کوئی بھی جد و اجداد نہیں

گر سنہ غربا ہیں سردی و جاڑا ان پر
روئیں طفلاں مگر سنتا کوئی فریاد نہیں

قول کر آئے یہاں آپ کو کیا یاد نہیں ‏ ‏ نے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں
فلسفہ رزم خدا یاد کی باتیں پڑھ کر ‏ ‏ سیکھیں جا کر کہاں ملتا کوئی استاد نہیں
عیش و عشرت کا بہم کرتے ہیں سامان عبث ‏ ‏ ٹھہرا جیتا ہیں لمحہ ایک تک شمار نہیں
فکر کہ وہ مہ کو لگی رہتی ہے نت روزی کی ‏ ‏ کرتے محنت ہیں شب و روز مگر شاد نہیں
اپنے اعمالوں کا اب پھل ملا ہم کو آ کر ‏ ‏ ساری تکلیف سہو۔ یہ کرو فریاد نہیں

کام وہ شرما کرو عقبیٰ میں راحت دیویں
کیوں کہ چلتی کسی کی واں یہ ہر فریاد نہیں

اب فرمائیے اس نظم کے اندر ایک حرف بھی ہے جس میں آپ کوئی سقم پیدا کر سکیں؟ حق تو یہ ہے کہ حضرتِ شرما نے "تغزل" جذبۂ قومی" اور عزتِ نفس ایسی حکمت آموز کیفیات کو جس" عالمانہ شان" سے نظمایا ہے" اُس پر زبان ستایش ہی گنگ ہے۔ پھر یہ دیکھکر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ مشاعرہ کے "انعام" سے حضرت شرما محروم رکھے جاتے ہیں کیوں؟ محض بے انصافی اور ناقدر دانی سے۔ کاش انعام دینے والوں میں ایک جج ملارموزی بھی ہوتے تو واللہ یہ انعام آنکھیں بند کر کے حضرت شرما پر سے نثار کر دیتے، مگر آہ شرما صاحب نہ مانہ ہی قدر دال نہیں اور اُس معاملہ میں جو حال آپ کا ہے وہی تو ہمارا بھی ہے۔ کیونکہ جس طرح آپ کو مشاعرے کا یہ "انعام" نہ دیا گیا ہمیں بھی تو اس انعام کا "جج" نہ بنایا، واللہ ہم تو خوفِ خدا سے کانپ جاتے ہیں

کہ آخر کار یہ ارکان مشاعرہ اس کھلی ہوئی ناقدردانی پر خدا کو منھ کس طرح دکھائیں گے۔

یہاں پہنچ کر "مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا اور حضرت گرامی قدر پرنسپل صاحب نے ارکان مشاعرہ کے مصارف اور اُن کی شب و روز کی تکالیف اور حضرت قبلہ احسنؔ کا تہجد کی نماز تک کھانا نہ کھانے کے ایثار و مستعدی کا احسان جتلائے بغیر الٹا مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مقابلہ کی نظموں میں کالج کے کامیاب طالب علم جناب عارف صاحب کو ججوں نے "کپ" دیا۔ پھر تمام مہمان شعرا کا ایک گروپ کھچوا کر اُن کے ساتھ کر دیا۔ اس گروپ میں ایک صاحب ایسے ضرور ہوں گے جنھیں اپنی تصویر کی خوشی عید کی خوشی سے زیادہ ہوئی ہوگی اور وہ کوشش کریں گے کہ کسی رسالہ میں یہ گروپ چھپ جائے تاکہ علی گڑھ کے ان بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ دنیا اُنھیں بھی دیکھ لے۔

چونکہ اس سال مشاعرہ میں نہ حضرت بدر جلالی بی اے اڈیٹر اخبار "خلافت" تھے نہ آخر وقت تک ملا رموزی رہے جو مہمانوں کی طرف سے طلبہ اور ارکان مشاعرۂ کالج اور یونیورسٹی کے شریک کار حضرات کا "دو بدو شکریہ"

ادا کرنے اس لئے ہم اس فرض کو یوں ادا کرتے ہیں کہ خدا ان طلبہ اور ارکان مشاعرہ کو شاد و آباد رکھے جنھوں نے ہم مہمانوں پر اپنا سب کچھ قربان کیا۔ یہاں تک کہ ذرا اُن طلبہ کو بھی کامیاب زندگی دے جنھوں نے اپنے داد کے شور سے ہم مہمانوں کی بعض غزلیں پڑھنا دشوار کر دیا اور اسے اپنی خصوصیت بنا کر اس سے خوش بھی رہے۔ حضرت قبلہ مولانا احسن اور حضرت گرامی پرنسپل صاحب کالج کے لئے دل ہی وقف ہے۔ شکریہ کیا، پھر یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ آپ حضرات کی بھی وہ نوازشیں ہیں جن سے بدنصیب اور بے وسیلہ مسلمانوں کے علوم و فنون اُن کی قومی خصوصیات اور ادبی روایات محفوظ رہ سکتی ہیں، حضرت احسن، حضرت پروفیسر لوپری اور دوسرے پروفیسر صاحبان منتظم طلبہ نے مہمانوں کے ساتھ ہی مشاعرے کے نظم اور وقار کو جس بلند پایہ خوش اسلوبی سے باقی رکھنے کی کوشش فرمائی اُس کے لئے ہم جس طرح ان اپنے دینی بھائیوں کے شکرگزار ہیں وہاں ہم حضرت گرامی پرنسپل صاحب کو بھی مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ اُن کے خلوص نیت سے اُن کے کالج کا یہ "آل انڈیا مشاعرہ" اپنی تمام روایات کے ساتھ کامیاب رہا، خدا کرے یہ مشاعرہ انہی مسرتوں کے ساتھ اس مرتبہ بجائے شدید جاڑے کے کسی معتدل اور خوشگوار موسم میں ہو۔ آمین۔

یہ تو تھی "روداد مشاعرہ" اب چند باتیں ایسی بھی سن لیجیے جنھیں ظرافت و خوش طبعی کے مقابل عقل و ضرورت سے تعلق ہے اور وہ یہ ہیں۔

علی گڑھ یعنی کالج اور یونیورسٹی کی علمی و ادبی روایات اور ذمہ داریوں کے یہ معنی نہیں کہ وہاں ہر سال کوئی ایسا ہی مشاعرہ ہوا کرے جیسا کہ ہندوستان کے ہر شہر میں ہوتا رہتا ہے بلکہ جس طرح علیگڈھ اسلامی ہند کی ذہنی اور عقلی اصلاح و ترقی کا ایک عظیم الشان مرکز، مشن یا مصلح ہے اُس کی نسبت سے یہاں کی ہر تحریک میں کوئی ایسی شان ضرور ہو جو مسلمانوں کے عام ذہنی اور فکری اداروں سے اُسے ممتاز و مفید ثابت کر سکے، اس لئے آیندہ مشاعرہ کے لئے ذیل کی تجویز و تحریک پیش ہے۔

(۱) آئندہ مشاعرہ میں جس قدر غزلیں اور نظمیں پڑھی جائیں گی وہ اس طرح روداد میں شائع نہ ہوں گی بلکہ ہر غزل اور ہر نظم پر ایک عروضی اور فنی تنقید ہو گی۔ اس تنقید سے یہاں شاعر کو اپنے نقائص کا علم ہوگا۔ وہاں ناظرین کی علمی اور فنی معلومات میں اضافہ ہوگا، اگر کلام قابل ستایش ہوگا تو اُس پر نہایت متانت سے بہتر داد دی جائے گی کیونکہ اس تنقید سے کسی کی دل شکنی مقصود نہیں بلکہ اصلاح و خدمت مقصود ہے۔

(۲) جو کہ کم علم، کم عمر اور کم سمجھ لڑکے یا شعرا اپنی واقعی اور علمی قابلیت سے بلند اور نمایاں غزل یا نظم دوسروں سے لکھوا کر پڑھتے ہیں۔ اُن کا

سختی سے بھانڈا پھوڑا جائے گا، کیونکہ شعر کی خوبی کا معیار، علم و عقل ہونا چاہیئے دانستہ چشم پوشی نہیں، ورنہ بچوں سے بہترین غزلیں پڑھوانے کا مقصد یہ ہوا کہ مشاعرہ کے صاحب علم و فضل اور ارباب ہوش و خرد شعر کا دانستہ طور پر "بے وقوف" بن کر یہ کہتے ہیں کہ "صاحبزادے خوب غزل کہی ایسی دانستہ داد کے یہ معنی ہیں کہ ہماری علمی مجالس کا ذوق "علم پسندی" نہیں بلکہ "حماقت پسندی" ہے اس لیے ضرورت ہے کہ ہر طالب علم۔ اور ہر "شاعرزادہ" آیندہ کلام غیر کو اپنا کہکر نہ پڑھے ورنہ اس پر ہم جو کچھ لکھینگے اُس کی شدت کے ہم ذمہ وار نہیں۔

(۳) ایسے شعرا کے نہایت مضحکہ خاکے اُڑائیں گے جو غزل پڑھنے سے پہلے اور غزل پڑھتے وقت مضحکہ انگیز تکلفات اور لائق استہزا حرکات و اطوار کو اختیار کر کے مجلسی ذوق میں غور و تاثر کی جگہ مذاق اور ہائے وہو کی بیہودگی کو رواج دے رہے ہیں اور یہ سب کچھ کام اس لیئے ہوگا کہ اس زمانہ کو علم و عقل اور تہذیب و روشن خیالی کا زمانہ کہتے ہیں۔ پھر کس قدر شرمناک بات ہے کہ اس درجہ بیداری میں ہمارا مجلسی رنگ انھیں لایعنی خرافات میں آلودہ رہے جو جہل و بے خبری کے عہد کا نہایت گھناؤنا اور گندہ ورثہ ہے۔

اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ آیندہ مشاعرے میں "غزل اور

شاعر دونوں کو سنبھل کر آنا چاہیئے۔ اور ہماری قلمی دیانت اور ذمہ داری کی یہی وہ "شرط بلاغ" ہے جسے ہم پورے ادب سے پہلے ہی آپ تک پہنچا رہے ہیں کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ ہم خوشامد کے بعد اگر حق کہنے اور حق لکھنے پہ آجائیں تو پھر یہ "اپنا علیگڈھ کالج والج تو ایک طرف وہ "آف انڈیا والی گورنمنٹ" تک سے نو ڈرتے نہیں اور یہی نو راز ہے جو علیگڈھ کالج اور علیگڈھ یونیورسٹی والے بھی ہم سے دور ہی دور رہا کرتے ہیں۔

وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلَاغ

علیگڈھ کالج کا مُشاعرہ

تمام دنیا کے علوم و فنون سے ۱۹۲۹ء کے آخر میں جب یہ ثابت ہوچکا کہ کچھ بھی ہو لیکن کالج میں مشاعرہ ہوکر رہے گا۔ اور عین جاڑے ہی کے موسم میں ہوکر رہے گا تو ہم بھی اپنی زندگی کو خدائے جاں آفریں کے سپرد کر گئے ٹھیک ۸ بجے شب کو حضرت گرامی ادب نواز کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بالقابہ (بھوپال) کے ایک شاندار موٹر پر سوار ہوکر علیگڈھ کالج کی مشہور مشاعرانی عمارت "عرف یونی ین کے دروازہ پر اس مستعلیق انداز میں جاکر کھڑے ہو گئے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی اگر وہ جو صاحبزادہ حامد کمال اور صاحبزادہ علی منصور حضرت ملا رموزی سے پہلے موٹر سے برآمد ہوئے تو تمام دنیا کے پروفیسروں کو یقین ہو گیا کہ ملا صاحب تشریف لے آئے۔

پروفیسر محمد حاذق، ایم اے ایل ایل بی، پروفیسر مولانا سید محمد علی احسن احسن مارہروی صدر انجمن خیابانِ اُردو پروفیسر عبد العزیز پوری ایم اے ایل ایل بی، فوراً ہی تشریف لائے اور السلام علیکم کے بعد یہ بھی تو دریافت نہ فرمایا کہ مزاج شریف، خیریت تو ہے، سفر میں آپ کے اسپیشل پہ کوئی بم تو نہیں پھینکا گیا۔ گھر میں تو سب طرح خیریت ہے اور بچے تو اچھے ہیں بس وہ تو آئے اور اسلامی جذبۂ اخوۃ میں ڈوب کر فرمایا۔ آیئے آیئے تشریف لایئے تشریف لایئے۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ ایک چھوڑ تین بزرگوں کے اس دل نواز اصرار پر کیسے ممکن تھا کہ ہم بجائے یونی ورسٹی میں تشریف لے جانے کے اُلٹے اپنے وطن تشریف لیجاتے

غرور و نخوت، تکبر، انانیت کی تمام عزازیلی قوتیں بیدار ہو گئیں جب جب ہمارے داخلہ پر طلبہ نے تالیوں سے "سر کو آسمان پر اٹھا لیا" صدارت والے چبوترے پر سے حضرت گرامی محمد عبد المجید صاحب قریشی ایم اے پرنسپل کالج نے کھڑے ہو کر استقبال فرمایا۔ چونکہ حضرت پرنسپل صاحب سے اب معاملات دوستی کی حد تک جا پہنچے ہیں اس لئے پہنچتے ہی "پرائیوٹ بات" کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ ممدوح ہنسے اور کچھ کچھ ہم پاس ہی بیٹھے تھے حضرت عالی پروفیسر عبد الشکور ایم اے، کسی قدر اونچے ہوئے اور مصافحہ کے

ہاتھ ہی سے ایک اور ہاتھ کو ہمارے ہاتھ سے ایک اور ہاتھ کو ہمارے ہاتھ سے جوڑکر فرمایا۔ آپ ہیں حضرت نواب مشتاق احمد خاں صاحب بی اے ڈاکسن، خلف اکبر حضرت نواب وقار الملک بہادر غفراں مکاں اور ملار موری سے ملنے کے شائق تصدیق یوں ہوئی کہ حضرت نواب صاحب ممدوح بھی بیحد تپاک سے پیش آئے وہ تو کہیے کہ "مشاعرہ کا وقت طلوع ہونیوالا تھا" ورنہ نواب صاحب بہادر ضرور ارشاد فرماتے ہیں کہ ملا صاحب کل صبح میری ہی کوٹھی پر تناول ماحضر فرمائیگا" افغانی سفیر کے پیچھے ہیں والی منزلت پروفیسر قادری بھی بیٹھے نظر آئے، چبوترہ کی پہلی سطر میں عالیجناب محمد عمر خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور جامہ وار کی شیروانی پہلے بیٹھے تھے۔

انگریزوں نے سائنس کے زور سے ایک ایسا "عمل" تیار کر دیا ہے کہ جس شخص کو صحیح وقت معلوم کرنا ہو وہ اپنے اُلٹے ہاتھ کی کلائی کو آستین ہٹا کر ایک مرتبہ دیکھے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ۸ بجکر ۲ منٹ آگئے ہیں اس لئے حضرت بسمل صاحب نے اسی عمل سے کام لے کر فرمایا کہ۔ لو بھئی ملا صاحب وقت ہو گیا مگر میرا چشمہ ٹوٹ گیا ہے۔ خیر بغیر چشمہ ہی کے سہی ادھر مشاعروں کی صدارت کے انتخاب کے لئے کوئی اذان تو دی نہیں جاتی ہے صرف قبلہ جناب احسن نے اُس شہر وغل میں جو

کالج کے طلبہ کی حلقوں میں گونج رہا تھا کچھ ہونٹ ہلائے تھے کہ پرنسپل صاحب صدر ہو گئے اور تالیاں بج گئیں۔

علوم اسلامی سے واقف مسلمانوں کے نزدیک انسانی جذبات و اعتقاد کے لئے وہ گھڑی سب سے زیادہ قابل عظمت و احترام ہوا کرتی ہے۔ جب خدا کے عرش و فرش کی عظمت و کبریائی کا کوئی مظاہرہ کیا جائے چنانچہ محترم صدر نے اشارہ کیا۔ اور ایک صاحب نے اٹھ کر قرآن محترم کے ایک رکوع سے اس مجلس کا جب افتتاح کیا تو ساری محفل پر ایک پر جلال سناٹا طاری تھا۔ چھوٹا اور بڑا "علی گڑھیا" ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت علیگڈھ والوں کے دینی احساس کا کس درجہ دلنواز و روح پرور اندازہ ہو رہا تھا۔

اس کے بعد صدر محترم نے زبانِ اردو میں اپنا وہ خطبۂ صدارت پڑھا جو اس مضمون کے ساتھ ہی کہیں نظر آئیگا۔ اور چونکہ یہ خطبۂ صدارت متعلق تھا مشاعرے سے اس لیئے اس کی اصولی داد بھی شعراہی کے ذمہ ہے اور ظاہر ہے کہ ہم پورے شاعر نہیں مختصر سے شاعر ہیں۔ اس لئے اس خطبہ کے متعلق اتنا کہہ سکتے ہیں کہ پرنسل صاحب کے ہزاروں انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں کے سامنے یہ بات ثابت کر دی کہ اگر ہندوستانی بھائی اپنی مجلسی زندگی میں خطاب و بیان کے لئے اپنی ملکی، قومی اور مذہبی زبان اردو کو اختیار کریں تو اسے سب سمجھ بھی سکتے ہیں اور اس سے انگریزوں کی نظر میں

ہندوستانیوں کی عزت بھی بڑھ سکتی ہے۔

حضرت مولانا احسن مارہروی قبلہ اور ممدوح کے "ادبی باڈی گارڈ" کی کرسیاں پہلے کب صدر کی کرسی سے دور ہوا کرتی تھیں جو اس مرتبہ بھی دور ہوتیں۔ اس لئے پاس ہی کی کرسی سے انجمن خیابان اُردو کے معتمد صاحب نے کھڑے ہوکر سال بھر کے کارناموں کو سنایا اور لوگوں نے اسے مجلس کی سالانہ روداد سمجھکر خوب سُنا۔ معتمد صاحب کی آواز صرف اُنھی کے کام آرہی تھی مجلس کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اب مشاعرے کے معاملات "چھڑ چلے تھے" کہ طلبہ میں ہل چل سی پیدا ہوئی اور یکایک تالیوں کے شور سے مکان گونج اٹھا دیکھا تو حضرت عالی نواب مسعود جنگ بہادر وائس چانسلر یونیورسٹی تھے بس اسلامیان ہند کی اس عزیز و مقبول ہستی کا اثر تھا کہ چبوترے پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے آپ کی تعظیم کے لئے تو بھی اٹھ میں بھی اٹھا، یہ بھی اٹھا اور وہ بھی اُٹھا یہاں تک کہ صدر جلسہ تک "اُٹھ ہوگئے" اب جو ممدوح رونق افروز ہوئے تو پھر مطلع عرض ہونے لگا اُس وقت خیال کیا کہ اگر آج کو نواب مسعود جنگ بہادر بالقابہ کی جگہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر قیصر جرمنی ہوتے تو وہ قیامت تک بھی مشاعرے میں رات کے گیارہ بجے تک شریک نہ ہوتے مگر نواب صاحب ممدوح کی شرکت سے ثابت ہوا کہ آپ اصول کی عزت

کرتے ہیں اور چونکہ مشاعرہ تھا کالج کا اس لئے نواب صاحب ممدوح کا اس کی حوصلہ افزائی کے لئے تشریف لانا اصل میں اصول کی پابندی تھی اور اخلاقاً تو مولانا احسن مارہروی نے ممدوح کی شرکت سے یہی فیصلہ کیا ہوگا کہ آیندہ سال کا مشاعرہ اس سے بھی شاندار منعقد کروں گا،،

پچھلے سال کی چند ملا رموزیانہ سفارشات" جو اس مشاعرے کی مجلس انتظامیہ میں منظور ہو چکی تھیں تو اس مرتبہ ملا رموزی ہی نے ان سے بڑی تکلیف اٹھائی، یعنی وہ جو ہم نے لکھدیا تھا کہ غزل کے درمیان" حقہ پانی بند" رہنا چاہیئے تو اس مرتبہ مشاعرہ کی اس اسمبلی کے وائج اینڈوارڈ" حضرت پروفیسر پوری اور اس شعری مجلس مقننہ کے" مارشل" پروفیسر محمد حاذق صاحب نے پانی، پان چائے اور سگریٹ کی تقسیم کی سخت ممانعت فرما دی تھی۔ کوئی تین گھنٹہ تک ایک پکے مسلمان روزہ دار کی طرح خموش بیٹھے رہے مگر خدا جانے کیا منظور تھا حاذق صاحب کو کہ جوں ہی کر اکبر آباد کے ایک ایک صاحب نے غزل شروع فرمائی حاذق صاحب کے بھاگوں سگریٹ کا چھینکا ہی ٹوٹ پڑا اور ممدوح نے آن کی آن میں سارے چبوترے والوں کو سگریٹ پلا دیئے۔ ایسی صورت میں پوری صاحب کو کون سا خوف خدا مانع تھا جو آپ خموش بیٹھے رہتے اس لئے آپ سے اور کچھ تو بن آیا تو

آپ نے ایک شاعر صاحب کا "گلا دھونے کے لئے" ایک گلاس پانی لاکر صدر صاحب کی میز پر رکھ دیا، شاعر صاحب نے بھی "پانی پی کر" خوب خوب غزل سنائی

نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ "شہرت" "تبلیغ" "ماحول" اور پراپیگنڈے کے اثر سے ہر قسم کا انسان متاثر ہو کر رہتا ہے اور وہ اس اثر کا تاج ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ اثر اس کی فطری وضع سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو مثلاً ایک وقت جب تھا "علیگڈھ کے کھنڈرے" دنیا کی حیرت انگیز چیز سمجھے جاتے تھے یا "شرارت" اور ریلوے اسٹیشن ماسٹروں کو دق کرنا علیگڈھ کے طلبہ کا خاصہ فطرت تسلیم کر لیا گیا تھا اور اسے قابل تعریف "زندہ دل" کہا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ روایات اب روایات پارینہ سے کچھ زیادہ نہیں رہیں پھر بھی ان کی شہرت کا یہ اثر ہے کہ علیگڈھ میں اصل کوہ خشک فطرت طالب علم بھی چاہتا ہے کہ وہ کوئی شرارت فرمائے تاکہ علی گڈھ کا طالب علم مان لیا جائے یا جیسے ہندوستان میں افغانیوں کو بہادر مشہور کر دینے سے ملا رموزی لیسے "فدویانہ جسم کے بزرگ" بھی ریلوے ٹکٹ کلکٹروں کو ہر آن مرعوب رکھنے پر تلے رہتے ہیں غرض اسی قسم کے جذبات کے تحت ایک "الہامی شاعر صاحب" نے جب غزل شروع کی تو اگرچہ

یہ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ پھر بھی طلبہ کی صفوف سے ایک آواز آئی کہ ہمیں مقطع سنا دیجئے اور تشریف لے جائیے۔

چونکہ کالج کی روایات میں علم و ادب کی تحقیق و ترقی بھی شامل ہے اس لئے مشاعرہ کے بعد یعنی دوسری رات کو "تمثیل" کے ذریعے حضرت داغ دہلوی اور امیر مینائی کے عہد کی شاعری دکھانا بھی منظور ہو چکا تھا اور اسی مقصد کے لئے حضرت مولانا احسن مارہروی قبلہ نے عالی منزلت نواب کلب علیخاں بہادر مغفور تاجدار رام پور کے مشاعروں کے صحیح حالات کی تحقیق و نقل کے لئے رام پور تک دوڑ بھی فرمائی تھی۔ اور رام پور کے نہایت معتبر سلطانی گواہوں" کے بیانات سے اس تمثیل کو "مطابق اصل" بنایا تھا۔ چند طلبہ کو حضرت داغ دہلوی، امیر مینائی و غیرہم کا لباس پہنا کر ایک درباری مشاعرہ مرتب فرمایا تھا۔

بظاہر تو یہی تھا کہ کالج کے چند طلبہ لمبی لمبی داڑھیاں لگا کر اور عبائیں پہنکر عبدالرحمن چغتائی کا بگڑا ہوا دیوان غالب بن کر بیٹھ گئے تھے مگر علمی اور فنی نقطۂ نظر سے ۱۹۲۹ء میں یہ ایک ایسی بے مثل چیز تھی" جس کے لئے حضرت مولانا احسن مارہروی اور پرنسپل صاحب کالج کے کمال تربیت اور حسن صلاحیت کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔

دوسری شب کو جب پردہ اٹھا تو واللہ حیرت سی طاری تھی ہر شخص یہ دیکھ کر کہ علیگڈھ میں رام پور کا شاعرانہ دربار اپنی ایک ایک ترکیب کے لحاظ سے مکمل و مرتب طریقے پر منعقد ہے، جس طالب علم نے جس شاعر کی نقل کی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس یہ تو بیٹھے ہیں امیر مینائی اور وہ دیکھئے وہ بیٹھے مونچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں حضرت نواب مرزا خاں داغ

اس تمثیل کے بیشمار ادبی نکات و فوائد ہم تو آج بسط و شرح سے لکھ کر پھینک دیں علیگڈھ کی طرف مگر سوال تو ہے حضرت گرامی قدر مولوی باہتمام محمد مقتدی خاں صاحب کے ناؤ کا کہ وہ ایسی طویل روداد کے بس چار صفحات چھاپ کر باقی پھینک دیں گے ملار موزی کی طرف تو اس نے خلاصہ یوں ہے اس تمثیل کا کہ اس کے دیکھنے سے ثابت ہوگیا کہ کہنے کو تو یہ دور ہے "عہد علم و ترقی" لیکن "ادبیات اردو" خصوصاً اردو کے شاعروں نے نصف صدی میں بس اس قدر ترقی کی ہے کہ سرکار کو آج کل چائے پلا دیتے ہیں باقی کے تمام حالات وہی ہیں جو آج سے نصف صدی پہلے مشاعروں میں پائے جاتے تھے، یقین نہ ہو تو "مجلہ ادبیہ نگار، لکھنؤ" بابتہ ماہ فروری ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں اردو کے مصدر شہر لکھنؤ کے ایک تازہ مشاعرہ کے حالات دیکھ لو اور پھر اس نصف صدی

پہلے کے مشاعروں کی تمثیل کو دیکھ لو وہی شور ملے گا اور وہی ہائے ہائے
باقی سب خیریت ہے اور حقیقتہً یہی ایک گراں قدر و گراں مرتبت فائدہ تھا
جو اس تمثیل سے علیگڈھ نے سارے ہندوستان کے مشاعروں کی اصلاح
اور تبدیلی کے لیئے اس تمثیل سے پہنچایا اور زندہ رہیں وہ طلبہ جنھوں نے
اس نقل کو اصل سے ملا دیا

تمثیل کے بعد ملک کے ممتاز و معروف شعرا حضرت عالی مانی جائسی
حضرت عالی فرح بنارسی، حضرت عالی جگر مرادآبادی اور حضرت عالی اصغر
گونڈوی نے بکمال خوش اسلوبی ایک ایک غزل سنائی اور ان حضرات
کی صحیح معنیٰ کی شعری قابلیت اور مسلمہ شہرت نے سامعین کو بے قرار
بنائے رکھا، وہ تو کہیئے کہ بس نہ چلا ورنہ طلبہ ان تمام حضرات کے اسٹیج
اسی چبوترے پر بنا دیتے مگر اٹھنے نہ دیتے کہ یکایک اس شاعرانہ
پارلیمنٹ کے لارڈ اسپیکر حضرت پروفیسر حاذق نے ۵ میل
فی گھنٹہ کی رفتار سے ایک تقریر مہمانوں کے شکریہ کے لئے فرما دی،
پھر کسے تاب کہ ملا رموزی صاحب کی "جوابی تقریر" تک دو شاعرے
بیں "باقی رہتا" بس ابھی کہ اس تقریر سے "جلسہ پر خموشی چھائی
تھی" کہ گھنٹی کی آواز آئی اور سب کے سب اپنے اپنے

"کمبل دبا کر..........فقط

آخر میں ہم حضرت گرامی پرنسپل صاحب کے حُسنِ انتظام حضرت گرامی مولانا احسن مارہروی کے بندوبست اور گرامی منزلت نوابزادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بالقابہ کو مبارکباد دیتے ہیں جنھوں نے اس ممتاز دار العلوم کی ادبی روایات کے بقاء و ترقی کے لئے اپنی بہترین توجہات کو مبذول فرمایا۔

بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ

سُسرال

وہ جو کہا ہے کہ "کافر برحق ہے اور کرنے والا جادو ہے" سو بالکل اسی طرح یہ بھی برحق ہے کہ غلامی کی آب وہوا میں پل کر جوان ہونے والے خواہ ڈاکٹر اقبال صاحب کا "قومی ترانہ" پڑھ لیں یا مسدس حالی از بر کر لیں، رہتے ہیں ہر حال خستہ و خوار، نہ جہالت ان کا پیچھا چھوڑتی ہے نہ وہ جہالت کا۔ افلاس ان میں رہتا ہے اور امراض ان میں نفاق ان میں تو وقت اور دولت تباہ کرنے کے لئے سینما اور تھیٹر کے تماشے ان میں منافقت اور غرور ان میں نو کا ہلی اور بے عملی۔ ان میں تعلّی اور تکبّر ان میں تو قمار بازی اور چانڈو نوشی ان میں غرض اخلاقی رذائل کو جتنا کثرت سے چاہو غلام اقوام میں جا کر دیکھ لو اور یوں کہنے کو ہائی اسکول بھی ان میں ہوتے ہیں اور محمڈن کالج بھی انجمن حمایت الاسلام

بھی ان ہیں تو انجمن اصلاح المسلمین بھی ان ہی کے خلاف ایسی قوموں نے آپ یورپ کی اُن قوموں میں جا کر دیکھیں جو آزاد ہیں اور جن کی قومی حکومتیں موجود ہیں تو اِن میں علم و ہنر، جوش عمل، زندہ دلی و خوش فکری اور حصول فتح و ظفر کے تمام وہ جذبات بیدار ملیں گے جن سے نجات ہے انسان کی اور جن پر بقاء و ترقی موقوف ہے، عام انسانوں کی اور ملا رموزی صاحب کی اب اگر یہاں یہ کہہ دیں کہ ہندوستانی قومیں بہ لحاظ رذائل اور غلط کاریوں کے سارے یورپ میں نمونہ ہیں تو ثبوت میں صرف ہندوستانیوں کے سُسرال کو پیش کر دینا کافی بھی ہوگا اور وافی بھی۔

غلامی انسان کے جس حصۂ حیات زندگی کو سب سے پہلے تباہ کرتی ہے وہ اخلاق ہے اور سُسرال کا رشتہ یا تعلق بھی انسان کے اخلاق ہی سے ثابت ہے۔ گاندھی جی کے یک سالہ سوراج سے نہیں سُسرال اصل میں ہندوستانی قوموں کی غلط کاریوں اعتقاد اور رسم کی فضولیوں اور ملعون و مردود آداب و ضوابط کا وہ مہلک اور مضحکہ خیز نمونہ ہے جس کی اصلاح پر ساری دنیا کے علیگڑھ کالجوں کو توجہ کرنا از بسکہ لازم و ضروری ہے

"جو کہتے ہیں کہ" اندھے کے ساون کو ہمیشہ ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے" سو ہندوستانیوں کے عقائد بھی کچھ اسی نوعیت کے واقع ہوئے ہیں آپ چاہے ہندوستانیوں کو مقدمہ سازش لاہور میں پھانسی کی سزا دے کر دیکھیں لیکن

وہ ہر وقت اور ہر حال میں پابند رہیں گے ان ہی رسوم و ضوابط کے جو عہد جہالت سے ان کے بزرگ انہیں ورثے میں دے گئے ہیں اور یہ کہنا بھول گئے تھے کہ اگر کبھی عہد علم و ترقی پاؤ تو ان جاہلانہ اصول و رسوم کو ترک کر دینا بس کہنے کو ساری دنیا کی قوموں کا ایک سُسرال ہوا کرتا ہے لیکن ہندوستانیوں کے سُسرال کو اگر اکبر آبادی سونٹھ کی منڈی کا پاگل خانہ کہا جائے تو غلط نہیں، اس سسرال کا جو مفہوم و منشاء طبقہ اعلیٰ میں سمجھا گیا ہے اسے تو اس لئے جانے دیجئے کہ خود طبقہ اعلیٰ کے افراد کو "غیر انسان" یا "چاروں والا" کہنا اس لئے موزوں اور صحیح ہے کہ اس طبقہ میں نہ صحیح معنی کی زندگی ہے نہ اصولِ زندگی، نہ ضابطہ کوئی چیز ہے نہ افعال پر کوئی احتساب نہ جذبات پر قابو، بس یوں سمجھ لیجیے کہ للّلے تللے آتا ہے اور اناپ شناپ خرچ ہوتا ہے، ان میں کا جو فرد جب چاہتا ہے کھانا کھاتا ہے اور جب چاہتا ہے نہ بھٹر چلا جاتا ہے یہ اپنے سے کم رتبہ انسان کو اپنا غلام تو سمجھ لیتا ہے مگر خدا کا بندہ نہیں سمجھتا، صرف برطانیہ کی حکومت یا برطانوی حکومت کے کانسٹبل سے اس کی رُوح تک لرزتی ہے اور گورنمنٹی احکام کو خاکم بدہن مکہ شریف سمجھتا ہے اس لئے اِن اندھوں کے سامنے رو بیٹے اور اپنی آنکھیں بھی کھو بیٹے۔

البتہ قابلِ ذکر طبقہ ہے طبقہ ادنیٰ کہ اسی کے افراد ہیں مذہب بھی ہے

اور اعتقاد بھی زندگی بھی ہے اور اصول زندگی بھی عمل بھی ہے، اور ولولہ عمل ایثار بھی ہے اور خدمت و قربانی بھی اور یہی وہ طبقہ ہے جس میں انسانی اخلاق و اجتماعیات کے جملہ اصول و ضوابط موجود و مروج ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ اس طبقہ میں بعض اعمال و اعتقادات پر اس قیامت کی شدت اور سختی روا رکھی گئی ہے کہ اگر وہ کل پرسوں تک دور نہ کر دی گئی تو پھر ان ہندوستانیوں کی اخلاقی اور اجتماعی زندگی کے فاتحہ کا پلاؤ بھی کہاں نصیب

اماں غضب خدا کا یہ جاہل یا غریب ہندوستان اس وقت کے قاعدوں پر آج تک عمل کر رہے ہیں جب ہم آپ بھی جاہل تھے اور انگریز بھائی بھی چنانچہ عہد جاہلیت میں کسی نے یہ بھی کہہ دیا ہوگا کہ "سسرال" بھی ان "مقامات مقدسہ" میں سے ملک ہے جن پر اپنا سب کچھ قربان نہ کر دینا جہنمی ہونے کی نشانی ہے چنانچہ بظاہر تو "سسرال" کہتے ہیں شوہر کے لئے اس کی بیوی کے خاندان کو اور بیوی کے لئے اس کے شوہر کے خاندان کو مگر اصل یہ ہے کہ جن خاندانوں کو "سسرال" کہا جاتا ہے وہ انسانی اوقات، دماغ، دولت اور اخلاق کی بربادی اور ہلاکت کے ایسے قرنطینے ہیں جن سے افریقہ جاتے وقت خدا ہر ہندوستانی کو بچائے۔ ہندوستانیوں میں "سسرال" بڑے احترام و ادب کی جگہ مانا جاتا ہے یا مانی جاتی ہے جہاں انسان جائے تو پاک صاف ہو کر بھاری

بھاری جوڑا بھی کرے، پھر سلام کرے تو جھک کر بولے تو بڑی تہذیب اور لیاقت سے، بیٹھے تو بڑے قاعدے اور قرینے سے جواب دے تو بڑی فصاحت و بلاغت سے، پھر اگر ایک مرتبہ سسرال جائے تو پھر عمر بھر جاتا ہی رہے، بیٹھے تو روزانہ بیٹھتا ہی رہے اور سوئے تو پھر تین چار ہفتہ تک سوتا رہے اسی طرح اگر سلام کرنے کا قاعدہ یہ ہو کہ بہت زیادہ جھک کر سلام کرے تو پھر ساس اور سسر ہی کو جھک کر سلام نہ کرے۔ بلکہ ساس کی چھوٹی لڑکی کو بھی جھک کر، اور بڑے لڑکے کو بھی جھک کر مزاج پرسی کو اگر جائے تو پھر خسر کے مزاج سے لے کر ساس، سالے، اور سالیوں کا مزاج بھی دریافت کرے، اور ایک قاعدہ ایسا بھی ہے جو سسرالی صرف دنوں میں سب کو محترم اور مقدس بنا دیتا ہے مثلاً "سسر" فقط ایک لفظ کا اضافہ کر دیجئے تمام محترم افراد خود بخود بنتے چلے جائیں گے۔ مثلاً "نانا سسر، دادا سسر، چچا سسر، خالو سسر، ماموں سسر، پھوپھا سسر، اب یہ تمام اقسام کے سسر خواہ وہ بیوی کی طرف کے ہوں یا میاں کی طرف کے ہوتے ہیں سب احترام کے قابل اور ان میں سے ایک سے بھی ہر بات کنارہ کشی بے رخی بے اعتنائی اور بے خبری، کمینہ پن کی نشانی ہے، عام اس سے کہ ان میں کے تمام قسم کے سسر جاہل ہوں، کند ناتراش ہوں، احمق ہوں یا گدھے ہوں، غرض کچھ بھی ہوں لیکن فقط سسر ہوں اس پھر داماد کے لئے

ان کی اطاعت، خدمت، غلامی، اور خوشامد فرض ہے یہی حال ساس کا ہے اِس سے بھی، نانی ساس، دادی ساس، چچی ساس، خالہ ساس، پھوپھی ساس، اور ممانی ساس، پیدا ہوتی ہے پھر یہ جتنی قسم کی ساسیں ہیں داماد پر ان سب کو جھک کر سلام اور ان کی غلامی فرض ہے پھر اگر آپ اتنے سلاموں سے تنگ آجائیں تھک جائیں اور اکتا جائیں تو اور جگہ تو ایسے سلام معاف بھی ہو سکتے ہیں لیکن معاف نہیں ہو سکتے تو فقط سسرال میں کہ یہ جگہ ہر حال میں مقدس بھی ہے اور محترم بھی۔ اور یہاں کا ہر فرد آپ کا بڑا بھی ہوتا ہے اور بزرگ بھی۔ مثلاً آپ کی ایک چھوڑ اگر بارہ سالیاں ہیں اور یہ سب کی سب بیوی سے عمر میں بڑی ہیں تو عام اس سے کہ یہ سب کی سب جاہل ہوں، لونڈیاں ہوں، ہڑدنگیاں ہوں، یہاں تک کہ آپ سے بھی عمر میں ایک ہزار سال چھوٹی ہوں مگر ادب آپ کے لئے عمر بھر کر بڑی ہو کر رہیں گی۔ پھر لطف یہ کہ ساری دنیا کے عقلمند اور تعلیم یافتہ لوگ بھی ان سب کو آپ کا بزرگ ہی تسلیم کریں گے، یہی حال آپ کے سالوں کا ہو گا۔ عام اِس سے کہ یہ سالے بھی علم و عقل کے لحاظ سے برے ہوں، کورے ہوں، لونڈے ہوں، بازاری ہوں، مگر آپ کی بیوی سے صرف عمر میں بڑے ہوں تو وہ عمر بھر آپ کے بھی بڑے اور بزرگ ہی بنے رہیں گے اور ایک علیگڑھ ہڑدالا ایسا نہیں جو انھیں آپ کا

قرار دیے۔ اور اسی لئے ہر حال میں اِن سب کی تعظیم اور بزرگی آپ پر مسلم اور فرض ہے۔ اور اسی وجہ سے اس قسم کا "چھوٹا پن" آپ کو بادشاہوں کے خاندانوں میں بھی اختیار کرنا پڑے گا اور مولویوں کے گھرانوں میں بھی، اور جو کہیں آپ حواس اور عقل کے لحاظ سے ہیں، ذرا بیوقوف سے ذرا گدھے سے، ذرا مفلس سے، ذرا تاریک خیال سے، اور بیوی پر ذرا فریفتہ سے، پھر تو آپ کی حیثیت سسرال میں وہی ہو گی جو یورپ والوں کے نزدیک افریقہ کے حبشیوں کی، یا شریف ہندوستانیوں کی محفل میں رنڈیوں کی یا ہندوستانی افسروں کی نظر میں اپنے ماتحت ملازمین کی، یا کوتوال کی نظر میں مشتبہ اشخاص کی، یا مار کھائے ہوئے طلبہ کی نظر میں ماسٹر کی، یا ننھے میاں کی والدہ کی نظر میں ملا رموزی صاحب کی یا ملا رموزی صاحب کی نظر میں ننھے میاں کی والدہ کی۔ یا ہندوستانی ٹکٹ کلکٹروں کی نظر میں ہندوستانی مسافر عورتوں کی، یا بے ٹکٹ سفر کرنے والے سادھوؤں کی نظر میں ریلوے پولیس کانسٹبل کی، یا مہاجن کی نظر میں مقروض لفٹنٹ گورنر کی یا ثناء اللہ امرتسری کی نظر میں قادیانیوں کی، یا "چھپن فیصدی" والوں کی نظر میں کانگریس والوں کی یا بڑی بیوی کی نظر میں چھوٹی بیوی کی، یا یو پی کے شاعر کی نظر میں اکبر آبادی گدھے کی، یا اعلیحضرت امان اللہ خاں کی نظر میں بچہ سقہ کی، یا اخبارات اُردو کے ایڈیٹروں کی نظر میں اپنے مضمون نگاروں کی یا

سرحدی پٹھانوں کی نظر میں لکھنو والوں کی، یا آج کل کے مسلمانوں کی نظر میں ہندو کی، یا ہندو کی نظر میں مسلمانوں کی، یا رات کو گشت کرنے والے پولیس مین کی نظر میں بے روشنی والے راہ گیر کی، یا ملا رموزی کی نظر میں بے نماز مسلمانوں اور منافق دوستوں کی۔

القصہ سسرال نام ہے چند یا زیادہ افراد کی غلامی، اطاعت، فرمانبرداری اور خدمت کا، اب اس سسرال میں ایک فرق یہ ہے کہ بیوی کے لئے اس کا سسرال نہایت مختصر ہوتا ہے۔ یعنی بیوی اپنے سسرال میں صرف شوہر کے والد صاحب، والدہ صاحبہ، اور بہن صاحبہ کو جھک کر سلام کرنے اور انہیں ہر حال میں راضی رکھنے پر پابند ہے۔ ان میں سے فقط شوہر کی والدہ اور شوہر کی بہن بیوی کے لئے آفت بھی ہے مصیبت بھی، کالی بلا بھی ہے۔ اور چڑیل بھی جن بھی ہے اور بھوت بھی، لیکن شوہر کے لئے بیوی کے خاندان کا ہر فرد بادشاہ بھی ہے اور کوتوال بھی اس لئے شوہر پر اپنے سسرال کے ہر فرد کی نازبرداری، غمخواری، ہمدردی، خدمت، تواضع، اور تابعداری از بسکہ لازم بھی ہے اور فرض بھی اور یہ فرض ہے جو آج تک علی گڑھ یونیورسٹی پنجاب سے ٹوٹا نہ بنارس میں ہندو یونیورسٹی کے قیام سے ٹوٹا۔ بلکہ انگریزی تعلیم کے لحاظ سے عورت ذات کو جو رتبہ دیا جا رہا ہے اس کے لحاظ سے تو سسرال عنقریب ایک طرح کی کوتوالی ہونے والا ہے۔ جہاں ہر سسرال میں چوری اور

جرم کا اقبال کئے بغیر چارہ نہیں ہوتا اس لئے شوہر کے لئے اس کے سُسرال کا ہر فرد گورنر جنرل باجلاس کونسل بھی ہوتا ہے۔ اور کمانڈر انچیف بھی۔

سُسرالی فرائض اور ذمہ داریوں کی تقسیم یوں رکھی گئی ہے کہ جو داماد جتنا بیوقوف ہو۔ اتنی ہی اس کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ بیوی کے خاندان میں شوہر کے خاندان سے اگر کوئی شخص ملاقات کو جائے تو اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے ساتھ مٹھائی بھی لے جائے، اور میوہ بھی، پھل بھی لیجائے اور ترکاری بھی، موزے بھی لے جائے اور پمپ جوتا بھی، جاڑے کا موسم ہو تو لحاف بھی لے جائے اور پشاور کی پوستین بھی۔ ورنہ سیر جائے۔ بہرحال بیوی کے سُسرال خالی ہاتھ جانا عیب بھی ہے۔ اور جہالت بھی۔ عام اس سے کہ بیوی کے سُسرال جاتے وقت آپ تین دن کے بھوکے ہوں یا پیاسے، بخلاف اس کے بیوی کے خاندان میں جاتے وقت شوہر اس قسم کی "چنگی" ادا کرنے یا لگان دینے سے بری ہے۔ لیکن اگر اپنی بیوقوفی سے کچھ لیجائے تو یہ اس کی "سعادت" بھی ہے۔ اور "شرافت" بھی۔ پھر بظاہر تو شوہر کو اپنے سسرال کے ہر فرد کو جھک کر سلام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اصلیت میں وہ کچھ بھی نہیں کرتا۔ اگر ہفتہ وار یا ہوار، یا پھر روزانہ بیوی کے خاندان کی خیریت دریافت کرنے حاضر نہیں ہوتا۔ پھر اگر بیوی کے بھائی جاہل ہیں

غنڈے ہیں، آوارہ ہیں تو شوہر کا سسرالی فرض ہے کہ وہ ان سب کو اپنے روپیہ سے تعلیم دلائے، نوکر رکھائے اور ہو سکے تو شادی بھی اپنے ہی روپیہ سے کرائے۔ یہی ضابطہ سالی اور سالیوں کا ہے یعنی اگر سالی کی شادی ہو تو اسے زیور بھی دے اور کپڑے بھی، اور جو سالی بیوہ ہو تو اس کا عقد ثانی کرائے یا پھر اپنے گھر میں رکھے اگر خسر صاحب پنشن پا جائیں۔ تو ان کی عاقبت بخیر تک ان کی امداد بھی کرے اور خدمت بھی، پھر اگر سسرال سے کوئی بھاگ جائے تو یہ داماد اُس کی تلاش کے لئے اخباروں میں اشتہار بھی دے، کوتوالی میں رپٹ بھی لکھوائے اور حُلیہ بھی۔ اور جو پتہ چل جائے کہ بیوی کا وہ بھاگا ہوا عزیز رسالہ "ادیب" پشاور کے دفتر میں جا ٹھہرا ہے، تو یہ داماد بھی بستر لے کر "ادیب" کے دفتر میں پہنچ جائے عام اس سے کہ اڈیٹر صاحب "ادیب" دونوں کو نکال باہر کریں۔ یا ایک کو۔

پھر اگر بیوی کے خاندان میں کوئی بیمار ہو جائے تو داماد کا پہلا یہ فرض ہے کہ وہ خبر سنتے ہی موٹر میں یا تانگے میں، ڈولی میں یا سائیکل پر اپنی بیوی کو لے کر حاضر ہو جائے۔ پھر مریض کے پلنگ پر خود بھی بیٹھا رہے اور بیوی بھی، پھر مریض کا تھوک بھی صاف کرے، اور بستر بھی، پھر اگر یہ مریض حکیم محمد اجمل خاں صاحب کے علاج کے لئے دہلی جانا چاہے

تو داماد اس کے ساتھ دہلی بھی جائے اور حکیم صاحب ممدوح ہوں۔ اس وقت ریاست رام پور میں تو یہ داماد دہلی سے رام پور بھی جائے۔ اور مریض کو ساتھ لے جائے، اور جو یہ مریض دہلی سے واپس ہوتے ہوئے راستے ہی میں "جاں بحق تسلیم" ہو جائے تو گھر آ کر بہنوں کے ساتھ چلّا چلّا کر خود بھی روئے اور اپنی ذاتی ماں بہنوں کو بھی سُسرال پہنچکر رُونے پر مجبور کرے۔

یہاں تک، تو تھا معاملہ فرائض کا اب مرتبہ ہے اتفاق و اتحاد کا۔ پس اگر آپ ذی ہوش بھی ہیں اور تعلیم یافتہ بھی، روشن خیال بھی اور انسانوں کے ہمدرد بھی اس لئے اگر آپ چاہیں کہ میاں بیوی کے خاندانوں میں باہمی اتفاق بھی رہے اور خوشگواری بھی، محبت بھی رہے اور ایک دوسرے سے خلوص بھی، لہذا اس جذبے سے اگر آپ اپنے سُسرال جاتے ہیں تو آپ کی ماں بہنیں آپ کی دشمن ہو جاتی ہیں۔ اس خیال سے کہ مبادا ہمارا بیٹا یا بھائی اپنے سُسرال والوں کا ہو کر نہ رہ جائے، اس لئے جب آپ سُسرال سے واپس آئیں گے تو آپ کی والدہ اور آپ کی بہن آپ پر طعن، ملامت، طنز، اور ڈانٹ سے بھی دریغ نہ کریں گی۔ اس موقع پر یا تو یہ ہوتا ہے کہ داماد اپنی ماں بہنوں سے کہتا ہے۔ بس بس معاف کیجئے اگر اب سُسرال جاؤں تو

اتنا کا اتنا بڑا ہی زمین میں سما جاؤں۔ یا پھر یہ ہوتا ہے کہ داماد اپنے اپنے سسرال کے جانے اور وہاں میل جول رکھنے کو اپنے خاندان والوں سے ہمیشہ "خفیہ پولیس" رکھتا ہے اور جوان حالات میں داماد ہوتا ہے بے خوف تو وہ یا اپنی ماں بہنوں کے ساتھ مل کر اپنے سسرال والوں سے لڑتا ہے یا خود اپنے خاندان والوں سے نتیجہ اگر یہ نکلے کہ داماد کو مارے جھگڑوں کے علیحدہ مکان میں رہنے پر عافیت نظر آئے تو پھر محلے والے کہتے ہیں کہ "لڑکا شادی ہوتے ہی نالائق ہو گیا"۔

تو آپ یوں خلاصہ کر لیجئے ان حالات کا کہ ہندوستانی غربا اور جاہلوں کے لئے سسرال ایک ایسی بلا ہے جس سے نہ قربت اچھی نہ جدائی اچھی۔ اور یہ سب کچھ اثرات ہیں تعلیمات اسلامی سے بُعد و بیخبری اور جاہل بزرگوں کی رسوم و عادات کی پیروی کے، اس لئے دعا کیجئے کہ خدا ان حالات سے ہمیں اور ہمارے ننھے میاں کی تازہ واردات کو محفوظ رکھے۔

پھر کیا ہوگا کہ کوئی ایک مسلمان اُٹھے اور ہندوستانی سسرالوں کے لئے ایک باقاعدہ قانون اسمبلی سے یوں منظور کرا دے جیسے ہندوؤں کے لئے "شاردا بل" منظور ہو چکا کہ اصل میں سسرالوں کی اصلاح مسلمانوں

کی اخلاقی اور معاشی اصلاح ہے۔ اور اسی پر مدار ہے حیات وزندگی کی خوشگواری کا۔

مسلمان ہو تو یقین کرنا کہ مُلّا رموزی صاحب کے سُسرال کے حالات نہایت عمدہ اور خوشگوار ہیں۔ ورنہ کہیں آپ خیال فرمائیں کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ ......

ساڑھے پانچ دن کا علیگڈھ

شہر علیگڈھ میں تانگے والے، دھوبی، جلاہے، قلی، مزدور، افیونی تمباکو فروش، زنانِ بازاری، اور اکبر آباد زدہ شاعری کے پتلے بھی رہتے ہیں، مگر یہاں کالج اور یونیورسٹی بن جانے سے عوام ہند اور خواص ہند جہاں علیگڈھ کا نام آیا اور لوگوں کے خیالات معاً کالج اور یونیورسٹی کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ پس اس یونیورسٹی سے جہاں ہر خوبی کی توقع قائم کر لی جاتی ہے۔ وہاں اس شہر کی ہر خطا اور ہر کمزوری بھی یونیورسٹی ہی کے سر تھوپ دی جاتی ہے، اور علمی و ادبی لوگوں میں تو علیگڈھ کے معنیٰ ہی یونیورسٹی ہے یا کالج، اس لئے قدرتاً اس شہر میں آنے والا سب سے پہلے یہاں کی تعلیم، تہذیب، تمدن، معاشرت، اجتماعیات اور اخلاقیات ہی پر نظر ڈالتا ہے لہذا ہم بھی نہ یہاں کے

"مدار دروازے کے حالات" بیان کریں گے نہ گھنٹہ گھر کا تذکرہ۔ پس اگر مسلمان ہو تو یقین کرنا کہ ملارموزی صاحب یہاں کی اصطلاح میں بیسویں دسمبر ۱۹۲۹ء کی دوپہر کو داخل ہوئے تو اس وقت سے لیکر وہ واپسی کے آخری منٹ تک یہاں متین سے متین اور بے تکلف سے بے تکلف رنگ میں رہے، مگر نگاہِ تحقیق و تنقید زندگی کے اُن حصوں کی دیکھ بھال سے کبھی غافل نہ رہی۔ جو اوپر بیان ہو چکے اور اصلاح و نکتہ چینی کی یہ نظر ہر جگہ اور ہر حال میں یوں پیوست ہوگئی گو یا کسی اکبر آبادی ماہر دنداں ساز نے بنی اسرائیل اسٹریٹ کے کسی پوپلے شاعر کے اُبال کھائے ہوئے منہ میں پوری کی پوری بتیسی فٹ کر دی ہو۔

کالج کے آل انڈیا مشاعرہ کے دوسرے ہی دن حضرت محترم پروفیسر عبدالعزیز پوری ایم اے۔ ایل ایل، بی نے ہمیں دعوت دی چونکہ ایک صاحب اور شریک تھے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ اصل دعوت اُن کے اعزاز میں تھی۔ اور ہم "برائے بیت" تھے یا اصل دعوت ہمیں تھی اور وہ بقدر ذائقہ تھے۔

حضرتِ پوری مدظلہ، تاریخ کے ایک متبحر عالم اور ادب نواز بزرگ ہیں۔ اور ہمارے مخلص ترین قدر داں اس لئے مُرغ مسلم اسے تواضع

فرمائی۔ جو ہندوستانیوں میں سب سے بڑھیا قسم کی غذا مانی جاتی ہے، کھانا کھانے کا طریقہ انگریزوں کی عادت کے موافق اختیار کیا گیا تھا یعنی میز کرسی پر بیٹھ کر کھا رہے تھے اس لئے باتیں بھی خاص ہوتی رہیں، اور ہاں خوب یاد آیا کہ اور بھی انواع واقسام کے کھانے موجود تھے ورنہ آپ یہی سمجھ لیں کہ بس ایک مرغا اگر پکا لیا تو کہاں کا تیر مارا۔

دوسرے دن پروفیسر احسن مارہروی صدر انجمن خیابان اردو کا دعوت نامہ آیا جس میں بعد سلام مسنون آنکھ لکھا تھا کہ آج میرے ہی ساتھ "نانِ خشک تناول فرمائیے" ممدوح کے سر سے پاؤں تک مشرقی عرف اسلامی اصول وقواعد کے کھانے تھے۔ اِس لئے نشست بھی "زمین دوز تھی"۔ اور دسترخوان بھی رنگین اور پھول بیل بنا ہوا۔ کئی قسم کا گوشت اور ایک قسم کی دال اور وہ بھی ماش کی دال تھی جو علیگڈھ کالج کے بورڈنگ سے لے کر ہندوستانی رئیسوں کے دسترخوانوں تک کی زینت سمجھی جاتی ہے، آخر میں مٹھائی بھی لائی گئی تھی، قبلہ احسن مارہروی اب ذرا بوڑھے سے ہو چلے ہیں اس لئے کھانے پر ہاتھ صاف کرتے وقت ہی آپ کے لئے گرما گرم روٹی پکائی جاتی ہے۔ اور عام روٹیوں کے مقابل آپ کے حصہ کی روٹی ذرا گداز

اور ایک طرح کا ڈنلپ ٹائر ہوتی ہے، مزاج میں پرانے زمانے کی تعلیم و تربیت یا اسلامی اصول و آداب کا رنگ غالب ہے۔ اس لئے میزبان کی تواضع پر مرتے ہیں۔ لہٰذا گھٹنے سے گھٹنا جوڑ کر بیٹھ گئے اور دس بارہ لقموں کے بعد یہ ضرور فرماتے تھے کہ "ذرا اس ترکاری کو تو چکھئے" اس دسترخوان پر ممدوح کے ارشد تلامذہ میں سے حضرت مولانا ابر گنوری اور حضرت مولانا آرزو احسنی بھی شریک تھے۔ کھانے کے بعد وہی اکبر بادشاہ کے زمانے کا حقہ آیا اور وہ پلنگ بھی بچھا دیے گئے تاکہ شاہی زمانے کے رنگ کا قیلولا بھی فرمایا جائے۔

جن لوگوں کے قلمی کارناموں سے علیگڈھ یونیورسٹی کا نام روشن ہو سکتا ہے ان میں حضرت جلیل احمد قدوائی بی اے علیگ کا مرتبہ خاص اور نمایاں ہے۔ مگر قدر دانی یہ ہے کہ رجسٹرار آفس میں نوکر ہیں اور دس بجے سے شام کے ۵ بجے تک دفتر کی کرسی کو بغیر رخصت اتفاقی چھوڑ نہیں سکتے، یہی وہ ذی علم جلیل احمد قدوائی ہیں۔ جن کے زور قلم نے ادب اردو میں روسی ادب و انشا کو پوری کامیابی سے روشناس کرایا، اور زبانِ اردو کا بلند سے بلند معیار رسالہ نہیں۔ جو آپ کے اچھوتے فسانوں کو شکر گزاری کے ساتھ قبول نہ کرتا ہو مگر لعنت ہی ہو ایسی قوم پر جس کے جلیل و رشید اور رموزی ایسے شگفتہ نگار

ملازمت کی حاضریاں دیتے پھریں اور نظام حیدر آباد کو یار لوگ اطلاع بھی نہ دیں۔

غرض یہ علیگڈھ کے صاحب باغ میں رہتے تو کیا ہیں رہنے والوں کی نقل کرتے ہیں یعنی ایک تنگ و تاریک مکان میں چند کرسیاں ہیں اور دیوار پر چند تصاویر، اور یہی کچھ نمونہ ہے اُردو کے برنارڈشا حضرت ملا رموزی کے ایوان کا، صبح سویرے حضرت احسن مارہروی کے تانگے پر سوار ہو کر جلیل صاحب کے مکان پر پہنچ رہے تھے کہ راستہ میں دو ٹین کے سائبان والا "سینما" نظر آیا۔ جو اسکول کالج، اور یونیورسٹی کے پردیسی طلبہ کی جیبوں سے روزانہ دولت خالی کرا لیتا ہے اسی سے ملا ہوا ایک انگریزی سامان کا بازار ہے اور انگریزی وضع کا ہوٹل، ان کے ہونے سے دولتمند طلبہ بجائے چار آنے کے ایک سے لیکر دس روپیہ تک کا کھانا روزانہ بھی کھاتے ہیں اور ہفتہ وار نوچ کھاتے ہیں، دولت کو تباہ کرنے کے ان ذرائع پر جو کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ تو اس لئے کہ سبھی شوقین واقع ہوئے ہیں۔

دروازے پر آواز دی تو جلیل صاحب یوں آ چھوٹے گویا ہم اُن کے کوئی "گم شدہ عزیز" تھے جو مع بستر کے آج اُن کو مل گئے کوئی دو گھنٹے تک بیٹھے مگر قسم لے لو جو اپنی بیوی کے سوا ہم میں سے

کسی ایک نے دنیا کا کوئی اور تذکرہ کیا ہو، بس فرق یہ تھا کہ ہم اپنی جاہل اور بھونڈی ننھے میاں کی تازہ والدہ کی برائیاں بیان کرنے میں مصروف تھے اور جلیل صاحب اپنی بیوی کے محاسن و محامد گنار ہے تھے مگر اس عزیز از جان داستان کو جس چیز نے مختصر کرا دیا وہ عقل و خرد کو جلا کر خاک کر دینے والا "دفتر کا وقت" تھا جس کی پابندی سے انشاءاللہ انتقال کے دن ہی فرصت نصیب ہو گی۔

حضرت خواجہ مسعود علی ذوقی بی اے، بھی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے ان ہونہار انشا پردازوں میں ہیں۔ جن کے مدرسے آفریں فسانے رسائل اُردو میں بے حد وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ ایک شیوا بیان شاعر بھی ہیں۔ اور اگر خدا انھیں مقدرت دیدے تو اسی یونیورسٹی میں ایم، اے، پاس کریں اور اسی میں ایل، ایل، بی، پھر اسی میں وکالت کریں اور اسی میں ڈپٹی کلکڑی مگر نہ جائیں تو یونیورسٹی کے باہر، یعنی وہ اسی یونیورسٹی کے بی اے ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ایم، اے کا امتحان دے کر پھر اسی یونیورسٹی میں داخل ہو چکے ہیں۔ آپ کے" زر خرید کمرے میں" حضرت اصغر گونڈوی اور حضرت جگر مرادآبادی سے تعارف ہوا۔ اور فوراً ہی ہم سب چائے پر بٹھا دیے گئے اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ پہلے ہی ایک دوسرے سے" رشتہ داری"

تھے

تھی اس لئے چائے کی پوری ایک پیالی بھی نہ پی ہوگی۔ کہ سب بے تکلف ہو گئے، حضرت اصغر گونڈوی اور حضرت جگر مراد آبادی وہ اچھوتے اور اور وجد آفریں طرز شعر کے موجد ہیں۔ اور ممدوحین گرامی کا رنگ تغزل کچھ اس درجہ بھی ممتاز و مختص ہے کہ وہ سارے ہندوستان میں اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی مشہور ہو چکے ہیں۔ حالانکہ وہ بچپن ہی سے اصغر گونڈوی بھی تھے اور جگر مراد آبادی بڑھاپے سے قریب ہونے والی عمر کے ایک رند مشرب اور پابند شریعت بزرگ اس لئے ہیں کہ خود ہماری اقتداء میں انہوں نے مغرب کی نماز پڑھی تھی، یہی عالم حضرت اصغر گونڈوی کے اتباع شریعت کا ہے۔ اور ممدوح محترم کو شریعت اسلامی کے ہر حکم کی پابندی سے جو شغف حاصل ہے اسی نے ملا رموزی کو ممدوح کی نگاہ میں "عزیز" بنا دیا۔ اور ممدوح نے ہمارے مضامین کی جس روح کی داد عطا فرمائی اس پر نہ علی گڈھ والوں کی نظر پہنچی نہ دیوبند والوں نے سمجھا۔ یعنی آپ نے فرمایا اور بڑے پیار سے فرمایا "کہ مجھے آپ کے مضامین میں آپ کی مذہبیت کا رنگ سب سے زیادہ عزیز ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضرت اصغر کو دنیا میں صرف مذہب عزیز ہے اس لئے مذہب کی ہر چیز کے وہ قدرداں ہیں اور اسی لئے ممدوح سے اب وہ دوستی ہوئی ہے۔ جو انشاء اللہ اب نہ ٹوٹے گی۔

اور خط و کتابت بھی جاری رہے گی۔

قبلہ پروفیسر احسن مارہروی کے شاگرد حضرت عزیز آرزو احسنی نے بڑے خلوص سے فرمائش کی کہ ہم اُن کے "مسلم یونیورسٹی بک ڈپو" کا معائنہ بھی کریں اس لئے حضرت آبر گنوری احسنی کی معیت میں اِس بُک ڈپو میں گئے، دیکھا کہ نہایت صاف اور ستھری الماریوں میں کتابوں پر کتابیں یوں رکھی ہیں کہ "نظر فریب کہیں الجھیں او رجگہ جگہ میز کرسیاں یوں رکھی ہیں کہ" دلکش کہیں جنھیں"، انگریزی دفتر کی تہذیب کے جملہ لوازم مہیا تھے کتابوں کی ترتیب یوں ہے کہ ہر کتاب بڑی آسانی سے مل سکتی ہے ہر قسم اور ہر زبان کی کتابوں کا ذخیرہ کافی سے زیادہ ہے البتہ اکبرآبادی خرافیات کا ذخیرہ نہیں ہے اور یہ دریافت کرنا بھی بھول گئے کہ احادیث اور قرآن محترم کی جلدوں کی تعداد کتنی ہے۔؟ بہرکیف حضرت آرزو حسینی کا خلوص سب سے بڑی کتاب تھی جو اس بک ڈپو میں نظر آئی۔

خبر ملی کہ حضرتِ نیاؔز فتحپوری اڈیٹر نگار لکھنو" بھی تشریف لے آئے ہیں اور حضرت پروفیسر حاذقؔ ایم اے کے ہاں مقیم ہیں۔ ہم حضرت حاذق کے ہاں پہنچے معلوم ہوا کہ حضرتِ حاذق حضرت رشید احمد صدیقی کے دولتخانہ پر ہیں، یہاں پہنچے تو پروفیسروں کا ایک مجمع تو موجود تھا۔ مگر نیاز صاحب

نہیں تھے۔ حضرت رشید احمد صاحب صدیقی موجود تھے اور حضرت قاضی جلال مدظلہٗ صدر جلسہ بنے بیٹھے تھے۔ ہم نے جاتے ہی قاضی جلال صاحب سے مصافحہ کیا۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ حضرت رشید صدیقی نے ہمیں اس وقت نہ پہچانا۔ اس لئے گو ہم نے ممدوح سے خیریت بھی دریافت کی۔ مگر کسی اخاہ ملارموزی صاحب کی آواز پیدا نہ ہوئی۔ ایک پروفیسر صاحب نے اللہ کے نام پر پان کھلا دیا اور ہم اٹھ کر چلے آئے بس آنا تھا کہ محفل میں کسی نے رشید صاحب سے کہا کہ۔ آہاں یہ کیا غضب کہ آپ ملارموزی سے مخاطب بھی نہ ہوئے تو رشید صاحب نے کہا ہوگا کہ لاحول ولا۔ واللہ میں تو نہ پہچانا اور آپ نے مجھ سے کہا بھی نہیں کہ آ گئے ہونگے جگر مراد آبادی اِس لئے رشید صاحب نے جگر صاحب سے کہا ہوگا۔

بھئی جگر سنو تو مجھ سے ایک بڑی فروگذاشت ہوگئی وہ ملارموزی بیچارے کل مجھ سے ملنے آئے اور بھئی قرآن مجید کی قسم مسلمان ہو تو یقین کرنا کہ میں انھیں مطلق نہ پہچانا' اور پتہ یہ قاضی جلال صاحب نے بھی بتایا تو کب جب وہ بیچارے چلے گئے۔ استغفر اللہ بعض اوقات عجیب قسم کی غلطی ہو جاتی ہے۔ اس لئے حضرت جگر مراد آبادی ذوقی صاحب کے کمرے میں آئے اور ہم سے سارا واقعہ نقل کیا۔ اور ہم اُسی وقت جگر صاحب اور اصغر صاحب کے ہمراہ رشید صاحب کے پاس گئے' نہ پوچھو اُس وقت

رشید صاحب کی ملاقات اور معذرت کا لطف، بڑے تپاک سے فرمایا کہ بڑی فرو گذاشت ہوئی جی میں تو آیا تھا کہ کہدیں کہ کیوں صاحب اگر کوئی مسلمان آپ کے گھر میں آپ سے ملنے آجائے تو بغیر تعارف آپ اُس سے ایسے ہی ملیں گے جیسے بغیر پہچانے مُلّا رموزی سے ملے؟ حالانکہ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ آپ اپنے گھر پر آنے والے ہر مسلمان سے دریافت فرمائیں کہ کہئے کہاں سے تشریف لائے، اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو میں حاضر ہوں کہ یہی آداب اسلامی ہیں ایک مُسلمان سے مُسلمان بھائی کی مُلاقات کے،

بارے ملاقات یا بے تکلفی تو پہلے ہی سے تھی اس لئے جلد نئے پُرانے ہو گئے، ممدوح نے فوراً ہی دعوت دی کہ شام کو یہاں تناول ماحضر فرمایئے اور ساتھ ہی رسالہ مخزن لاہور میں ہمارے لکھے ہوئے شذرات کی پختگی کی بے حد داد عطا فرمائی اور اسمیں زبان اُردو پر تبصرے کی وسعت تحقیق اور رنگینی پر اظہار حیرت و پسندیدگی فرمایا" اب کیا تھا مُلّا رموزی بھی مارے خوشی کے پھُول گئے اور دن میں دس مرتبہ حاضر ہونے کی ٹھان لی

یہاں سے چلے تو پروفیسروں کی معاشرت کا اندازہ کرنے کے لئے خواہ مخواہ ہر پروفیسر کے مکان پر جا پہونچے، پھر نہ پوچھئے ان حضرات کے مکانوں کی انگریزی آرائشیں، بس فرنیچری حساب سے ہر پروفیسر کا مکان نئی دہلی تھا جس کی تعمیر پر ۱۴ کروڑ روپیہ صرف ہوئے ہیں۔ جن قیمتی قالینوں پر کبھی

اپنے بزرگ تکیہ لگا کر بیٹھا کرتے تھے یہاں ان قالینوں پر اب کرسیاں اور انگریزی جوتے بیٹھا کرتے ہیں، دروازوں پر انگریزی پردے، میزیں آئینے، تصاویر، پائین باغ، وغیرہ کے مصارف اگر جمع کئے جاویں تو یقین آجاتا ہے کہ اگر ان پروفیسروں کی تنخواہ میں دوگونہ اضافہ نہ کیا گیا تو وہ طلبہ سے رشوت لینا شروع کر دیں گے، دیر تک سوچتے رہے کہ جب اساتذہ کی اس معاشرت کو کم سمجھ طلبہ روزانہ دیکھتے رہیں گے تو پھر وہ تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے مکانوں کو بھی بکنگھم پیلس، بنانے کے خواہشمند نہ ہوں گے تو کیا احباب سے اپنے مکان کے باہر والے چبوترے پر چٹائی بچھا کر ملا کریں گے؟

ان مکانوں کے انگریزی فرنیچر پر خدا جانے کئی ہزار روپیہ انگریز تاجروں کو ان پروفیسروں سے ملتا ہوگا، مگر وہ تو کہا ہے ناکہ ؎

خدا نے پانچ پروفیسروں کو یکساں نہ کیا۔ سو ان پروفیسروں کی انگریزی معاشرت کا توڑیوں ہو گیا ہے کہ اللہ میاں نے انہیں میں سے ایک صاحب کو پروفیسر فاروق ایم ایس، سی، بنا ڈالا ہے۔ چنانچہ ممدوح کے مکان کو دیکھ کر پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ آپ نے تمام انگریزی معاشرت والے پروفیسروں سے "مقاطعہ مکانی" کیا ہے اور اسی لیئے آپ ایک ایسی چارپائی پر لیٹے رہتے ہیں جو نہ آسانی سے کروٹ لینے دیتی نہ کبھی مسہری کا

ذائقہ دیتی، ممدوح محترم کے ایک شاگرد پیچھے پڑ گئے کہ چلئے اور حضرت فاروق سے ملاقات کیجئے کہ ممدوح آپ سے ملنے کے بے حد شائق ہیں،

علی گڈھ کی تمام عمارتوں کی بدقسمتی سے آپ کا کوٹھی نما حجرہ سڑک سے بالکل ہی متصل واقع ہو کر رہ گیا ہے، دنیا جہاں کے تمام مکانوں میں داخل ہوتے وقت پہلے کرسی، قالین، یا تخت نظر آتا ہے لیکن ممدوح کی اِس مہمان سرائے میں سب سے پہلے آپ کی چارپائی نظر آتی ہے اور اس چارپائی پر فاروق صاحب یوں لیٹے رہتے ہیں کہ جب چاہو جناب فاروق کو چارپائی سمجھ لو اور جب چاہو چارپائی کو جناب فاروق کہہ لو اب چارپائی اور اس پر لیٹنے والے کے فرق کو ظاہر کرنے کے لئے ایک کمبل ہے جو آدھا چارپائی پر رہتا ہے اور آدھا نیچے لٹک جاتا ہے جس کے اُٹھانے کی فرصت نہ فاروق صاحب کو ملتی نہ خود کمبل کو یہ توفیق کہ وہ اُٹھ کر خود ہی اوپر آجائے مگر فاروق صاحب کی اس وجد آفریں طرز معاشرت سے ہماری نگاہیں اُن کے اصل کمال تک جو جا پہونچی تھیں تو انکا تماشہ بھی یوں دیکھ لیا کہ ہمارے حاضر ہوتے ہی اسلامی اخلاق و تواضع کا یہ مجسمہ یوں تڑپ کر کھڑا ہو گیا گویا اُسکا کوئی حقیقی بھائی یورپ کے لام پر سے زندہ و سلامت آکر اُس سے مل گیا ہے، بے ساختہ فرمایا" اور بھئی ہم تو تم سے ملنے کے لئے بہت بے چین تھے اور بھئی تم تو بہت خوب لکھتے ہو تم نے ہمارے لئے بھی جو کچھ لکھا تھا وہ ہمیں بہت پسند آیا، اچھا تو اب کھانا

میرے ہی ساتھ کھانا" آہ جناب فاروقؓ کی اس سادہ زندگی اور پُرخلوص
گفتگو سے ہمیں وہ پاک طینت مسلمان یاد آرہے تھے جو اپنے بھائیوں سے
ملنے میں کبھی صحابہ کرام کا سا خلوص و جذبہ صرف کرنے کو خدائے عرش و
فرش اور رسول اکرم علیہ السلام کی خوشنودی کا باعث سمجھا کرتے تھے مگر
اب تو مسلمان گورنمنٹی خوشنودی کے لئے ترکوں اور عربوں کے خلاف،
رنگروٹ بھرتی کراتے ہیں اور مسلمانوں کے درمیان بغیر انٹروڈیوس اور
انٹروڈکشن، کے بات چیت ہونا بدتہذیبی کہا جاتا ہے اور پھر ملاقات
بھی ایک سگریٹ اور شیک ہینڈ پر ختم ہو کر رہ جاتی ہے کہ یہ سب
اثرات ہیں غلامی کی زندگی کے اس لئے بُرے بھی نہیں،

ملّا رموزی صاحب کے لئے سب سے زیادہ پُرلطف چیز اگر کوئی ہو سکتی
تھی تو وہ حضرت رشید احمد صدیقی، ایم اے ایڈیٹر رسالہ سہیل علیگڈھ
ہی ہو سکتے تھے جبکہ بہ لحاظ" لکھ پڑھ" اُن کا ہمارا رشتہ بہت زیادہ مضبوط
ہے۔ کیونکہ وہ بھی ظریف لکھاڑ واقع ہوئے ہیں اور ہم بھی بڑے،
لطیف لکھاڑ، پھر تحریر کے بعد ذوق میں بھی وہ وحدت کہ کبھی وہ ملّا
رموزی بن جاتے اور کبھی ہم رشید احمد صدیقی وہ ہم سے صورت
میں مشابہ اور ہم اُن کے لباس سے مشابہ، بس اگر کوئی فرق ہے،
تو یہ کہ وہ اپنا وطن ترک فرما چکے ہیں اور ہم پردیس کو ترک کر چکے ہیں

آج کی دعوت میں نہ فقط ہم بلکہ حضرت جگر مرادآبادی، حضرت اصغر گونڈوی، ایسے ہم خیال شریک تھے میزبانوں میں رشید صاحب کے ساتھ حضرت پروفیسر محمد صادق صاحب ایم۔اے۔ ایسے سلیم المذاق دوست کی شرکت ایک طرح کا مزید برآں والامعاملہ ہوگئی تھی، جناب محمد فاروق ایم۔ ایس۔ سی بھی اس دعوت میں کمبل اوڑھ کر شریک ہو چکے تھے، واضح ہو کہ اس ضیافت کا سلسلہ مغرب سے قبل ہی سے شروع ہو چکا تھا، حضرت حاذق چائے لائے، حلوہ لائے، کیک لائے، اور ایک عباپوش بزرگ کو بھی لائے جو حضرت جگر مرادآبادی کے کلام کو صرف اُن ہی کی زبان سے سنکر ذرا مسکرا دیتے ہیں، البتہ جو کبھی بہت زیادہ مست ہو جاتے تھے تو کلمہ کی اُنگلی ہلاکر ذرا گردن بھی مٹکا دیتے تھے مگر منہ سے تعریف کے الفاظ ادا نہیں ہوتے تھے،

رات ہو جانے پر کھانے والے مسلمان بھائی جمع ہوئے اور ماشاءاللہ جمع ہوتے ہی چلے گئے، مُلّا رموزی دیکھنا چاہتے تھے کہ آخر حضرت رشید احمد صدیقی ایم، اے میں وہ کون سی فراغتیں جمع ہیں جو وہ اس قدر لطافت نگار واقع ہوئے ہیں سو اِس حساب سے الحمدللہ کہ اُنہیں ہم نے ایم، اے پاس پایا، پروفیسر پایا، ایک بہترین اور

قیمتی فرنیچر والے مکان کا مالک پایا، ایک نوکر کا آقا بھی پایا مگر ممدوح کی ۲ دو چیزوں نے دل توڑ دیا، ایک یہ کہ وہ اس زرق برق فرنیچر والے مکان میں بھی روئی کی دلائی اوڑھے لیٹے رہتے ہیں؛ دوسرے یہ کہ وہ ایک ایسے موذی مرض میں مبتلا کر دیے گئے ہیں کہ الامان، گویا اُنکا دماغ روح آلام اور صدموں سے فارغ نہیں چنانچہ پچھلے دنوں اُنہوں نے لکھنؤ میں اپنے گردے میں چیرا بھی دلوایا تھا، جسے انگریز لوگ "آپریشن"، کہتے ہیں، اس آپریشن کے رُوح فرسا صدمات کو ممدوح نے شیطان کی آنت،، کے عنوان سے رسالہ "نگار لکھنؤ" میں لکھا بھی ہے اور خوش فکر اور شگفتہ مزاج لوگوں کی بیماری کو ممدوح نے تاؤ کھا کر فطرت کی بدمذاقی لکھ مارا ہے، بظاہر رشید صاحب نہایت خاموش مسلمان ہیں۔ لیکن حضرت حفیظ جالندھری ایڈیٹر رسالہ مخزن لاہور نے ۱۹۲۸ء میں ہم سے اُن کی اس عادت کو کان میں کہدیا تھا، اس لئے ہم بے پروا تھے، چنانچہ وقت آیا یعنی کھانا آیا اور حضرت رشید کی بہار آفریں بے تکلفی شروع ہوگئی، اس کے یہ معنی نہیں کہ ممدوح کھانا دیکھ کر ہی بے تکلف ہوتے ہیں بلکہ ممدوح تو اُس وقت بھی دُلائی اوڑھے لیٹے رہے اور کھانے کا حق ادا کر گذرے، حضرتِ حاذق ایم، اے، مقصود یہ ہے کہ حضرت رشید بے تکلفی کے موقع پر بے تکلف اور متانت کے موقع پر متین رہنے

والے بزرگ ہیں۔ اب جو اس پر لوگ باگ انہیں خموش اور عبوساً قمطریرا
کہے جائیں تو پھر ہم صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ یہ اثر ہے ممدوح پر اس
صحبت کا جس میں زندہ دلی اور خوش طبعی کے کفارے کے طور پر ایک
ایسے عبا پوش بزرگ کو داخل کر لیا گیا ہے جو اِس مقدس عبا کو دن بھر
تیمّاً آستین سمجھ کر پہنے رہتے ہیں، پھر یہ اثر ہو گا، کھولت پناہ حضرت قاضی
جلال مدظلہ العالی کے اُس چشمہ کا جو بتاتا رہتا ہے کہ اب قاضی صاحب قبلہ
دنیا سے بیزار ہو رہے ہیں، کھانے والوں میں اول تو حضرت اصغر، حضرت
جگر، حضرت جلیل، حضرت ذوقی، جناب فاروقی اور حضرت ملّا رموزی شریک تھے
مگر برادر گرامی حضرت حاذق کا طرزِ کھانا بتا رہا تھا کہ جب کوئی مسلمان بھائی
کھانے پر اُتر آتا ہے تو یوں کھاتا ہے، کھانوں میں انتہائی مشرقیت صرف
کی گئی تھی، اور ان کھانوں سے زیادہ لذیذ وہ باتیں تھیں جو ہو رہی تھیں
اسی حال میں حضرت گرامی فاضل ازہر مولانا ابرار حسین فاروقی، مولوی
فاضل، تشریف لائے اور ہمارے اوپر تاؤ کھا کر بیٹھ گئے کہ کیوں نہیں ہم
ممدوح کے ہاں کھانا کھانے گئے، کھانے کے بعد وہی جناب فاروقی
ایم، ایس، سی، جن کا مفصل تذکرہ ہم نے اوپر لکھا ہے، اور حضرت رشید
صدیقی نے بھی دسمبر کے نگار، لکھنؤ میں اُن کی تعریف لکھی ہے، چائے
کے خواستگار ہوئے اور بالآخر حضرت حاذق کو چائے لانا ہی پڑی دو مٹکی کی

موقع ہاتھ آیا اور فوراً ہی مشاعرہ تو کیا، ایک چھوٹی سی "مشاعری" منعقد کر ڈالی، بس وہی حضرت جگرؔ اور حضرت اصغرؔ تھے جو اپنا کلام پڑھ رہے تھے اور ہم لوگ تھے کہ واہ وا اور آہ آہ کر رہے تھے "حضرت رشید احمد صدیقی اس معاملہ میں بھی بیحد خموش واقع ہوئے ہیں، یعنی کسی کے شعر پر وہ چلا کر داد نہیں دیتے، گویا وہ شعر سمجھنے میں ایک طرح کے "فی البطن الشاعر، واقع ہوئے ہیں۔ یعنی سمجھتے سب ہیں مگر منہ سے ظاہر نہیں فرماتے، ایسے لوگوں کو شعر سناتے وقت شاعر کو بہت تاؤ آتا ہے چاہے وہ اُسکا اظہار نہ کرے، یہی عالم ایک فرنچ قسم کے حکیم صاحب کا تھا، جنہوں نے دیوار کے سہارے خموش بیٹھے رہنا ہی شاعری کی طبی داد سمجھ لی تھی، بس ہم، جلیلؔ، حضرت حاذقؔ اور پروفیسر عظمت الٰہی زبیری، ایم، اے، تھے کہ ہر شعر پر چیخ رہے تھے گویا مذکورہ اصحاب کے نزدیک ہم تمام چیخ کر داد دینے والے بے وقوف ہی ہوں گے؟ غرض کوئی بارہ ۱۲ تیرہ بجے رات کو یہ مشاعری اور جناب فاروقؔ کی چائے ختم ہوئی اس اثناء میں حضرت جگر مرادآبادی کے وجد آور نغموں کے بیچ میں ایک مرتبہ جناب فاروقؔ نے بھی گایا تھا جس کی تکلیف کو ہم آج تک کم نہیں کر سکے، اس لئے دعا ہے کہ خدائے رحمان و رحیم آئندہ سال ہمیں اِن تمام بھائیوں سے

پھر ملائے مگر جناب فاروق کے گانے سے عمر بھر نہ ملائیے،

اِن ملاقاتوں کا سلسلہ ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ایک دن ہم اُس اصل معائنہ کے لئے روانہ ہوئے جو متعلق تھا یہاں کی تعلیمی دنیا سے اور ایسے ہم ہمیشہ خود کو نہایت غیر معروف اور خُفیہ پولیس بنا لیتے ہیں، کہ اصل مضمون نگاری اِسی کا نام ہے یہ نہیں کہ گھر میں بیٹھے نقشے کھینچ دیں لندن اور پیرس کے صبح کا وقت تھا اِس لئے گرم کوٹ اور گرم گلوبند فرما کر یوں پا پیادہ روانہ ہو گئے گویا ہم کوئی چیز ہی نہیں، چل پہ چل ٹھیک بارہ۱۲ بجے دن کے اُس صحرائے علی گڈھ کو عبور کیا جو نیورسٹی کو یونیورسل یا میرس ہوسٹل سے جُدا کرتا ہے، اُس وقت مارے گرمی کے جو حال تھا اُسے ہم جانتے ہیں وہ نہیں جان سکتے جو برقی پنکھوں کے نیچے بیٹھکر ایڈیٹری فرماتے ہیں، کہ ایسی ہی تکالیف اُٹھاتے ہیں، ارباب خدمت و اصحاب قلم اجنبی اور ناواقف کی حیثیت سے جس کے کمرہ جاتے وہ بڑی تیز نگاہوں سے دیکھتا، سوالات کرتا، خشک جواب دیتا، معقولیت بھی صرف کرتا جھجک بھی جاتا اور نام و نشان بھی دریافت کرتا اور ہم سمجھے کہ ان کی معاشرت اور عام اخلاق کی ایک ایک رگ کو بھانپ رہے تھے، دیکھا یہ کہ ہر ایک کے پاس ایک سے لیکر پانچ اور دس جوڑے انگریزی جوتے کے، ہاکی کرکٹ، فٹ بال، اور ٹینس کا قیمتی لباس، سیگریٹ، داڑھی صاف

کر سکے انگریزی اوزار بعض کابیوں میں عشق ریز و عشق انگیز اشعار کو نون پر کوٹ، پتلونوں پر پتلونیں، ہیٹوں پر ہیٹیں عرف انگریزی ٹوپیاں موزوں پر موزے، مزاجی کیفیت یہ کہ کھانا کھائیں تو نوکر کی امداد سے پانی پئیں تو نوکر کی امداد سے، پان کھائیں تو نوکر کی امداد سے اور موزہ پہنیں تو نوکر کی امداد سے، یہاں تک کہ بعض کے بوٹ کے تاگے بھی نوکر ہی باندھتا ہے، پھر ایسے حالات سے نکل کر جب مسلمان ڈپٹی کلکٹر ہوتے ہیں تو وہ اپنے ہم قوم کے ماتحتوں کو قلی مزدور اور اپنا غلام سمجھتے ہیں تو کیا برا کرتے ہیں ان چیزوں کا جو مالی اثر پیدا ہوتا ہے اصل میں افلاس کی بنیاد یہی ہے، طلبہ کی اس بلند اور رئیسانہ معاشرت کی شرم سے وہ طلبہ موت کے منہ میں جا پڑے ہیں جو حصول علم کے شائق ہیں، مگر بلند اور انگریزی معاشرت اختیار نہ کرنے کے باعث شہر کی تنگ و تاریک کوٹھریوں پر پڑے مصروف تعلیم ہیں مگر وہ کبھی یہاں کے کھیلوں اور پارٹیوں اور جلسوں میں شریک ہونے سے جو شرماتے ہیں تو کسے پروا مگر ان بچوں کی خطا ہی کیا جب ان کے اساتذہ کی انگریزی رنگینیاں کوئی دیکھے، ان کے ڈہائی، ڈہائی سو روپیہ نقد کے سوٹ دیکھے، ان کا کلین شیو دیکھے، ان کے ولائتی جوتے اور ولائتی موزے دیکھے تب اسے پتہ چلے کہ بچوں کا انگریزی پن تو ان کے اساتذہ

کے سامنے کچھ بھی نہیں، کیونکہ یہ بچے تو دس سے چار بجے تک اسلامی وضع کی وردی بھی پہن لیتے ہیں، مگر پروفیسر بھائی تو چوبیس[24] گھنٹے لارڈ برکن ہیڈ بنے رہتے ہیں،

اسی حال میں جا پہونچے حضرت گرامی پروفیسر عبدالعزیز پوری۔ ایم اے ایل ایل، بی، کے کمرہ پر ممدوح اُسی وقت کھانا کھا کر پلنگ پر لیٹے تھے ادھر ہم گشت سے کوفتہ بختہ ہو گئے تھے، اس لئے صفا کہدیا کہ پوری صاحب کچھ دیر ہم قیلولا فرمائیں گے جو فقط پچیس[25] منٹ میں ختم ہو جائیگا، پوری صاحب نے فوراً پلنگ چھوڑ دیا اور پاس کے کمرہ میں جا بیٹھے اور ہم سو گئے، اٹھ کر کیا دیکھتے ہیں کہ تمام دروازے بند ہیں اور پوری صاحب طلبہ کے کمرہ کے ایک ایسے برآمدہ میں بستروں کے انبار پر بیٹھے ہیں جو دھوپ سے خاصا گرم ہو رہا تھا، اُس کمرہ کی صفائی کیلئے طلبہ نے اپنا تمام سامان اس برآمدہ میں ڈال دیا تھا اور پوری صاحب نہایت بے تکلفی سے بستروں کے اس انبار پر طلبہ کے پاس بیٹھے طلبہ سے باتوں میں مصروف تھے، حیرت سی ہو گئی، پوری صاحب کی اس سادگی اور طلبہ سے اس بزرگانہ ربط پر جاتے ہی ہم نے کہا کہ یہ آپ اپنا، کمرہ چھوڑ کر اس دھوپ میں کیوں آ بیٹھے تو فرمایا کہ جو شخص تھوڑی دیر کو آرام چاہے اُسے بڑے اہتمام سے آرام دینا ہمارا فرض ہے، آپ

کبھی سلیقہ سکھایا ہے آج کل کے طریق تعلیم نے طلبہ کو اساتذہ کی تعظیم و تکریم کا
کا چائے کے بعد بعض حیدرآبادی طلبہ نے ہمارا فوٹو لینے کی خواہش ظاہر
کی، اُسوقت خیال آیا کہ صوبہ پنجاب کی طرح حیدرآباد میں علم و ادب دوستی
کے جو جذبات بیدار ہو رہے ہیں یہ اُنہی کا قدرتی اثر ہے جو حیدرآباد کے
طلبہ مُلّا رموزی کا فوٹو اپنے پاس اس لئے رکھنا چاہتے ہیں کہ مُلّا رموزی ایک
مشہور سا مضمون نگار ہے ورنہ یوں تو ہمارے جہالت زدہ شہر کے طلبہ بھی
یہاں موجود تھے جو اگر ہمیں ہماری ادبی خدمات کی بناء پر ایڈریس بھی دیتے
تو کم تھا مگر اُن میں سے بعض نے ہمیں ذرا جھک کر سلام ہی کر لیا یہی غنیمت
تھا، آخر کار فوٹو لیا گیا، ایک فوٹو تنہا تھا اور ایک پوری صاحب کے ساتھ یہاں
سے چل پہ چل پھر اُسی میدان سے گذرے جہاں مارے دُھوپ اور گرمی سے
ہم کوٹ بر داشتہ ہو گئے تھے، اب یہاں ایک ایسی چیز نظر آئی، جس نے تمام تھکن
کو دور کر دیا اور یونیورسٹی والوں کے لئے بیساختہ دعا نکلی یعنی یہاں طلبہ کی پریڈ
ہو رہی تھی، طلبہ باقاعدہ فوجی وردی پہنے قواعد سیکھ رہے تھے اور اُن کے
ساتھ جو فوجی باجا بج رہا تھا وہ اُس روح کو بیدار کر رہا تھا جو انگریزی لونڈر،
موزوں اور چست پاجاموں کی نزاکتوں میں دب کر مُردہ سی ہو گئی ہے بس،
ایک یہ شغل تھا جو مسلمانوں کے بچوں میں شجاعت و جفاکشی کی زندگی کو اُبھار
سکتا ہے، افسوس کہ حضرت جلیل احمد قدوائی اور حضرت ذوقی کے لکھنوی،

تھکے ہوئے تھے اس لئے آپ کو زیادہ سکون کی ضرورت تھی ہم نے کہا کہ آپ جو اپنے شاگردوں میں اس بے تکلفی سے بیٹھے ہیں سو اصل شان یہی ہے، استاد اور پروفیسر کی اور ایسے ہی اساتذہ ہوا کرتے ہیں جو طلبہ کے دُکھ درد اور ان کے ہر حال میں شریک رہکر اُن کے مصلح اور نگران بن سکتے ہیں اور اسلامی تعلیمات و آداب میں ایسے ہی اساتذہ کو مکرم و معظم کہا گیا ہے، ابھی کہ ہم ممدوح محترم کے ان برتر از ستائش جذبات کی تعریف میں مصروف تھے کہ انہی طلبہ میں سے بعض نے ہماری چائے کا بندوبست کر کے حضرت محترم پوری صاحب سے سفارش ہم پہونچائی کہ ہم اُنکی چائے کو یا پی لیں یا کھالیں، ممکن تھا کہ ہم بھی انگریزی قسم کا نخرہ اور اکڑا اختیار کر کے "نو تھینک یو" کہہ دیتے مگر مسجدوں کے حجروں میں بیٹھکر تعلیم پائے ہوئے مُلّا رموزی میں ان عزیز از جان بھائیوں کی تواضع کے رد کی تاب کہاں، جا بیٹھے، چائے پر، اس عرصہ میں چند طلبہ حضرت گرامی، پوری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہم نے غور سے دیکھا کہ وہ حضرت پوری صاحب کے احترامی اور تعظیمی اثر سے کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے اور یہ پوری صاحب کی اُسی شفقت کا اثر تھا جو وہ اپنے شاگردوں سے ایک مہربان بھائی کی طرح روا رکھتے ہیں ورنہ جناب یہاں کے طلبہ کو اگر کوئی اُستاد ایک آدھ قمچی مار دے تو اُسی دن تمام علی گڈھ میں ہڑتال ہو کر رہجائے

ہیں نے اُن طلبہ کے قریب لیجانے کے عوض میں حضرت رشید احمد صدیقی کے قریب لیجاکر بٹھا دیا ورنہ ہم اُن طلبہ کی تعریف بھی اتنی ہی لکھتے جتنی دوسرے طلبہ کی بُرائی لکھی ہے،

یونیورسٹی میں ایک مسجد اس خیال سے بنائی گئی ہے کہ اُسمیں طلبہ نماز پڑھا کریں گے اور جب طلبہ نماز پڑھیں گے تو اُن کے اساتذہ بھی نماز پڑھیں گے اور جب اساتذہ نماز پڑھیں گے تو کالج اور یونیورسٹی کے، دوسرے مُلازمین بھی نماز پڑھیں گے اور جب اتنے لوگ نماز پڑھیں گے تو مسجد کو خواہ مخواہ وسیع بنانا چاہئے لہٰذا یہ مسجد نہایت وسیع اور شاندار ہے، مگر نمازیوں کا یہ حال ہے کہ درمیانی گھنٹوں میں چند طلبہ مسجد میں آتے ہیں، بیٹھتے ہیں، ٹہلتے ہیں، پھرتے ہیں، پانی پیتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، اور نماز سے پہلے پھر پڑھنے چلے جاتے ہیں، اور اسی لئے مسجد کے دروازہ پر کسی نے یہ نہیں لکھا کہ بغیر نماز کے مسجد میں آنیکی سخت ممانعت ہے، اب خدا جانے قیامت کے دن یونیورسٹی والے بخشے جائیں گے یا یہ ویران مسجد بخشی جائیگی!

وہ جو خود صاحب علم و بصیرت ہیں اور اس لئے مُلّا رموزیؔ کے قلمی، کارناموں کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں، مُلّا رموزیؔ کی ملاقات کیلئے بے چین تھے، اِس لئے حضرت جلیل احمد قدوائی، بی، اے، علیگ

نے اپنے دولت خانہ پر اس ملاقات کا انتظام فرمایا تھا، مغرب کی نماز کے وقت یہاں حضرت خواجہ غلام السیّدین، ایم، اے، حضرت پروفیسر ہاشمی، ایم، اے، اور حضرت محترم زیدی صاحب، بی، اے، ہیڈ ماسٹر تشریف لائے، بس پھر کیا تھا خلوص و محبت کا ایک دریا تھا جو اُمنڈ آیا تھا، دیر تک سلسلہ کلام جاری رہا، بڑے پیارے بھائی ہیں جو مُلّا رموزی ایسے ستم آزمودہ انسان سے محبّت کرتے ہیں، ایران و عراق گھومے ہوئے ہیں اس لئے خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ ہم سے یہ بھی دریافت فرمایا کہ آپ نے فارسی کہاں تک پڑہی ہے اس کے دو ہی معنی تھے یا تو یہ کہ تم فارسی بھی نہیں جانتے اور بنے پھرتے ہو مُلّا رموزی یا یہ کہ تمہاری فارسی کی استعداد کچھ کچھ اچھی ہے جو تمہارے مضامین میں کہیں کہیں نظر آتی ہے ورنہ ان دونوں باتوں کے سوا آپ ہی بتائیے کہ یہ فارسی استعداد دریافت کرنیکا کون سا موقع تھا؟

سب سے زیادہ قابل احترام ذوق اُن ملاقاتوں کا تھا جو یہاں کی بعض بلند خاندان اور تعلیم یافتہ خواتین کی طرف سے ظاہر کیا گیا، خدا ان بہنوں کو خوش رکھے بس اُن کی ملاقات کے بھروسہ پر انشاءاللہ آئندہ سال ہم بھی اپنے ننھے میاں کی والدہ کو علی گڈھ لیجائیں گے، کیسی خوش ہونگی، اس فقرہ کو پڑھ کر ہمارے ننھے میاں کی اجمل والدہ صاحبہ مدظلہا خدا اس علی گڈھ،

کو تا دیر سلامت رکھے کہ اس میں ابھی بیشمار نمونے اسلامی خلوص و حمیت کے موجود ہیں، اور بھائی ہمیں بھی خدا زندہ رکھے مگر سکون و فراغت کے ساتھ، آمین، پروفیسر مولانا ابرار فاروقی، مولوی، فاضل، اور حضرت نواب شتاق احمد خاں صاحب بہادر خلف اکبر حضرت نواب وقار الملک بہادر مغفور سے انشاءاللہ آئندہ سال ملاقات ہو گی۔

علیگڈہ سے گھر تک

بے سرو سامانی اور ننھے میاں کی والدہ سے جھگڑ کر سفر کرنا ہی کہاں کا
راحت رساں سفر ہوا کرتا ہے، جو ایسے مسافر کی سفر سے واپسی پُرلطف
کہی جائے، بادشاہوں سے لیکر لیڈر اور وائسرائے قسم کے تھانیداروں
تک کی واپسی پر غور کیجئے کہ جب یہ لوگ اپنے شاندار دوروں،
اور سرکاری مہمانیوں سے واپس ہوتے ہیں تو نہ فقط ان کی صورتوں
کے تمام خوبصورت بخیئے یوں اُدھڑ جاتے ہیں گویا وہ اس سے پہلے
مراد آباد کا لوٹا تھے، جس کی ساری قلعی اُڑ چکی ہے، چہرہ پر شاندار
مہمانی کی حسرت بھری یادیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر برستی ہے۔ جیسے
تین چار سال سے صوبجات متحدہ میں بارش ہورہی ہے۔ اب جو اگر
سفر سے واپسی کے وقت آپ کو یہ خیال آجائے کہ گھر میں ننھے میاں

کی والدہ پہلے ہی سے تاؤ کھائے بیٹھی ہیں، اور اپنے ننھے میاں کے لئے
انہوں نے جو کھلونے، کپڑے، اور خود کے لئے دہلی کی جو بالیاں منگائی
تھیں، اُن کے دام آپ سفر ہی میں خرچ فرما چکے ہیں، اس طرح
کہ کہیں آپ نے اپنی شان بڑھانے کے لئے قلی مزدور کو دو آنے
کی جگہ چار آنے دیدیئے، کہیں تانگے والے پر رعب بٹھانے کیلئے
انعام عطا فرما دیا، کہیں بجائے سات نمبر بڑی پینے کے آپ نے
قینچی چھاپ سگریٹ نوش فرمائے، تو اب آپ کے لئے سفر سے گھر
تک کی واپسی ایسی ہوگی، جیسے عدالتوں سے ہندوستانی قیدی،
جیل حوالات واپس ہوا کرتے ہیں، یا کوئی ہندوستانی تھانیدار صاحب
پنشن کے وقت تھانیداری کا آخری حساب کتاب سمجھا کر ہمیشہ کے
لئے اپنے گھر جا رہے ہوں، یا کسی دن بھر چلے ہوئے تانگے کا گھوڑا
اپنے اصطبل کو واپس ہو رہا ہو، یا دفاتر کے ہندوستانی منشی لوگ
شام کے وقت گھر جا رہے ہوں، یا جس طرح حضرت رشید احمد
صدیقی، ایم، اے، علی گڈھ سے لکھنؤ ایڈیشن کے لئے تشریف
لے جا رہے ہوں، یا جیسے حضرات سیمابؔ و ساغرؔ علی گڈھ کے
مشاعرہ سے رات کی تاریکی میں پاپیادہ بغلوں میں ہاتھ دبائے گھر
واپس ہو رہے ہوں، یا دیہات میں بیگار کی گاڑیاں سرکاری سامان

لادے جارہی ہوں، یا جس طرح کچّے آموختے والے بچّے اسکول جارہے ہوں، یا کوئی ہندوستانی وفد لندن سے واپس آرہا ہو، یا کوئی نامور پہلوان کشتی لڑکر دنگل سے واپس آرہا ہو۔ یا کوئی ہندوستانی گداریل سے بے ٹکٹ اُتر کر مسافرخانہ ڈھونڈ رہا ہو، یا کوئی ایکٹر تھیئٹر کے اسٹیج سے اپنے ایکٹ میں فیل ہو کر واپس ہورہا ہو، یا کوئی قادیانی مولوی مولانا ثناءاللہ امرتسری کے مناظرہ سے پلٹ کر اپنے گھر جارہا ہو، بس اسی طرح یا اس سے ذرا کچھ اچھی حالت میں ہماری واپسی ہوا کرتی ہے اس مرتبہ کی واپسی پر یہ دلنواز خبر پہلے ہی سے مل چکی تھی کہ خوشدامن صاحبہ کی حالت نازک ہے، اور ہماری "وہ" اُن کی عیادت کے سلسلہ میں میکے تشریف لے جاچکی ہیں اور خیر سے یہ سُسرال بھی واقع ہوا ہے، پردیس میں گویا اس وقت نہ ہم اپنے شہر میں تھے اور نہ ہماری "وہ" اپنے مستقر پر۔

ادھر علی گڈھ ایسے علمی وادبی شہر میں ہم جس آن بان اور قلمی لیڈر کی حیثیت سے مہمان بنے ہوئے تھے اس نے احساس کی متکبرانہ قوت کو اعتدال سے زیادہ مشتعل کردیا تھا اور چوبیس گھنٹے تو کیا ہاں کوئی پانچ اوپر دس مرتبہ خود کو علی گڑھ کا گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل، سمجھتے رہتے تھے، آپ ہی انصاف کیجیے کہ جس علی گڑھ یونیورسٹی

کے بڑے بڑے افسر، پروفیسر، پرنسپل اور رئیس طلبہ مُلّا رموزیؔ صاحب کے میزبان ہوں، دعوتوں پر دعوتیں، ضیافتوں پر ضیافتیں، اور ملاقاتوں پر ملاقاتیں ہو رہی ہوں، ہمارے فوٹو لئے جا رہے ہوں، قلمی تحریریں بطور یادگار لی جا رہی ہوں، وہی مُلّا رموزیؔ صاحب جب واپس ہوں تو یوں کہ یکایک مُلازم سے کہیں، کہ بس چائے پلا دے اور بستر باندھ دے، پھر اس پر ملازم کہے کہ حضور خیر تو ہے، آپ تو پرسوں لاہور جا رہے تھے، کانگرس میں اور ہم کہیں۔ ابے تجھے کیا؟ بس تو باندھ بستر ہمارا اور رہنے دے تیری کانگریس وانگریس، یہ نہیں دیکھتا خط کہ وہاں تو حالت خراب ہو چکی ہے، خوشدامن کی اور تو خواب دیکھ رہا ہے لاہور کے، بے وقوف کہیں کا، جا اور کوئی عمدہ، اور تیز سا تانگہ لے آ کیونکہ نواب صاحب کا موٹر تو گیا ہوا ہے شہر ظاہر ہے کہ تانگے سے ہماری مراد یہی ہو سکتی تھی کہ وہی شریف صورت اور شریف رفتار تانگہ، آئیگا، جس میں دو سواریاں پیچھے اور ایک سواری آگے تانگے والے کے برابر بیٹھا کرتی ہے اور جو عوام میں، ربر ٹینٹ تانگہ، کہلاتا ہے، ادھر موسم تھا جاڑے کا اور وہ بھی، علی گڈھ کے جاڑے کا اس لئے اپنے ساتھ ایک لحاف کے ساتھ اپنی "ادن" کا لحاف بھی اس لئے لے آئے تھے کہ وہ تو تھیں میکے میں

اِس لئے پڑا رہتا نا یہ لحاف، ہمارے گھر میں بیکار، اور مسلمانوں میں بس یہی ایک عیب ہے کہ وہ کفایت شعار نہیں، پھر یہ دو لحاف، ایک توشک، ایک تکیہ، اور ایک چادر مل کر مجموعی حیثیت سے، جس درجہ موٹے ہو سکتے تھے، آپ اندازہ فرمالیجئے، اِس پر لوہے کا ایک کالے رنگ کا بڑا سا صندوق اگر طرفہ تماشہ نہیں تو طرفہ وزن، تو تھا، اور ہاں ایک کمبل بھی، مگر ہمارے خیال میں جاڑے کے موسم میں اِس قسم کا شاندار بستر اگر خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تو بدنما کہنے والا بھی بے وقوف ہی مشہور ہو گا، بس ابھی کہ چائے کی پیالی منہ سے الگ ہوئی تھی یا منہ چائے کی پیالی سے الگ ہوا تھا کہ لے آیا ملازم علی گڑھ کا وہ "مسجد نما اکہ" جس کی ہلاکت بار اذیتوں کا رونا پچھلے سال رسالہ "علی گڑھ میگزین" میں اِس امید پر رو چکے تھے کہ شاید، یو، پی کے باشندوں کو اِس اکّے پر تاؤ آئیگا اور وہ اپنی اپنی میونسپلیٹوں سے، ان اکّوں کو ہمیشہ کے لئے "بعبور دریائے شور" کرا دینگے، دیکھتے ہی، دماغ کھول گیا، مگر کرتے کیا کہ ریل کے جانے میں باقی رہ گئے تھے "منٹ پندرہ" نخرہ کرتے تو ریل گاڑی کوئی ہماری ملازمہ تو تھی نہیں جو کھڑی رہتی، مگر ادھر "پوزیشن" کا خیال کہ اگر شیخ سدّو کے اِس علی گڑھی قبے میں جا بیٹھے تو اور تو کچھ نہیں، صرف بازار والے دیکھ کر کہیںگے

کہ ملاحظہ ہو آپ تشریف لیجا رہے ہیں آپ! مگر معاً خیال آیا کہ جب بستر
کا انبار خود ایک گنبد بنا ہوا ہے تو کیوں نہیں بیٹھ جاتے اس کے بیچ میں
تانگے کے بھاگتے بھاگتے اگر کسی کی نظر پڑی بھی تو وہ، یہی سمجھے گا کہ
کسی مسافر کا فقط بستر ہے اور جو کسی جنگی کے سپاہی نے تانگا روک کر
بستر دیکھا اور اُس کے بیچ میں ہم بیٹھے نظر آ گئے تو وہ یہ کب سمجھے گا،
کہ یہی ہیں مُلّا رموزیؔ صاحب ہ؛ اِس لئے عربی زبان میں کچھ پڑھا اور
بیٹھ گئے، اُسی طرح اسٹیشن پر پہنچے تو تانگے والے نے ریل چلی جانے کی
بدحواسی کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا اس لئے اُس نے اس موقع سے یہ
فائدہ اُٹھایا کہ ڈبل کرایہ طلب فرمایا۔ مگر اُسے یہ کہاں پتہ تھا کہ جو شخص مولوی
طفیل احمد صاحب سوؔدی ایڈیٹر رسالہ،، سود مند علی گڑھ،، کے شہر سے جارہا ہو
وہ کفایت شعاری کے معاملہ میں پھانسی کے تختہ پر بھی ”غازی علم دین شہید“
ہی رہتا ہے اور اُس پر کوئی بدحواسی طاری نہیں ہوتی، اِس لئے بس
دیدئے ہے چار گنڈے، چلاتا ہی رہ گیا میاں یہ کیا مگر ہم نے پلیٹ فارم کے
اندر جاکر اُس وقت اپنے مغربی جانب دیکھا، جب قلی نے بہ آواز بلند
کہا، حضور بس یہیں آ رہے گا سکن کلاس، ابھی کہ ٹکٹ کے لئے کھڑے
روپیہ گن رہے تھے کہ سامنے خواجہ خضر کی صورت بنائے آ گئے حضرت
ہادی الضاری، ہماری آتحاہ علیکم السلام کے بعد ہی کہا۔ آپ تو جائیں گے

سکن میں، پھر ہمارا اور آپ کا کیا ساتھ؟" استغفراللہ بس اُداس سی، پڑ گئی، ہمارے تمام سیکنڈ کلاسانہ ارمانوں پر، اور سمجھ گئے کہ اب تو گھر تک ہادی صاحب کے ساتھ "تھرڈ" ہی میں جانا پڑیگا، کیونکہ یہ ہیں ہمارے بچپن کے دوست پھر "مکتب بھائی" "پھر پیر بھائی" اور پھر سب سے آخر "وطن بھائی" اس لئے اگر نہ گئے ان کے ساتھ تھرڈ کلاس میں تو جاتے ہی سارے شہر میں کہتے پھرینگے:۔

"دیکھا آپ نے مُلّا رموزی صاحب کو؟

"اماں دماغ بگڑ گیا ہے دماغ،

"ذرا رئیسوں اور نوابوں نے منہ لگا لیا ہے تو وہ شخص سیدھی بات تک نہیں کرتا"

"ہوا کیا؟

"اماں میں علی گڑھ سے آرہا تھا، حضرت سے خاصا یارانہ ہے اس لئے میں تو گیا پاس اس خیال سے کہ چلو سفر میں ساتھ ہو جائیگا۔ مگر جناب اُس نے تو بات تک نہ کی اور بیٹھ گئے، میاں "سکن کلاس" میں بن کر لاٹ صاحب،

"خدا کی شان تو دیکھئے، آج جو میاں کو چار پیسے سوا ملنے لگے ہیں تو سیدھی طرح زمین پر پاؤں نہیں رکھتے اب نہ وہ شہر دار کو پہچانتے ہیں نہ" بے شہر دار کو۔ اور دیکھو نا یار! نام بھی عجیب قسم کا رکھ لیا ہے

مُلّا رموزی۔ آپ نے بھی آج تک ایسا نام کہیں سُنا؟

اس پر اُن کے مخاطب فرماتے،

سچ کہتے ہو بھائی ہادی بالکل سچ پڑھ لی ہے نا ذرا سی انگریزی مُلّا صاحب نے امّاں کل کی بات ہے کہ یہی مُلّا رموزی خدا بخشے خالو میاں صاحب کے پاس گھنٹوں بیٹھے خوشامد کیا کرتے تھے اور یہ اُنہی کی مہربانی ہے کہ آج مُلّا صاحب مُلّا صاحب پکارے جاتے ہیں، مگر آہ ہادی صاحب آج نہ ہوئے خالو میاں مرحوم ورنہ وہ آپ کو بتاتے کہ یہ میاں مُلّا رموزی صاحب ہیں کون، بڑے باوضع بزرگ تھے آپ کبھی ملتے تو بہت خوش ہوتے، خُدا کی قسم، ہادی بھائی، رستہ چلتے کے کام آتے تھے اور مجھے تو واللہ آخر دم تک اپنے بیٹے کی طرح سمجھا۔

اس پر تیسرے مخاطب بات کاٹ کر فرماتے۔

تو پھر جانے بھی دیجئے، ایسے مُلّا صاحب کو، مُلّا صاحب ہیں تو اپنے گھر کے تمہارا کیا بنا لیں گے، بس اچھا کیا تم نے جو پوچھ لیا کہ بھٹ میں جائے گا تم اپنے فرض سے پاک ہو گئے، اب ان کی اشرافت ہے کہ وہ تمہارے ساتھ نہ بیٹھے۔ امّاں بہت مشکل ہے، ذرا امیری کو برداشت کر لینا اب تو جناب وہ ہمیں بھی بھول گئے ہیں واللہ راستہ میں کبھی مل جاتے ہیں تو مُنہ پھیر کر نکل جاتے ہیں اور اب تو نہیں دو انگلی کا سلام بھی ناگوار ہے چلو

ہٹاؤ بھی لو یہ بیڑی پیو۔

"بس اِس قسم کے آوازوں سے محفوظ رہنے کی ایک یہی تدبیر تھی، کہ بیٹھ جاتے سیدھی طرح ہادی صاحب کے تھرڈ کلاس میں کیوں کہ اسی قسم کی ذہنیت اور فطرت ہوا کرتی ہے آج کل کے دوستوں کی اور آج کل کے دوستوں ہی پر کیا موقوف ہے وہ حضرات فردوسی، حافظ شیرازیؒ ایسے ارباب کمال کے ساتھ آخر اُن کے شہر والوں نے کیا کیا؟ اور دور کیوں جاتے ہو یہ آج کل ہی کے حضرات جوشؔ ملیح آبادی حیدر آباد، میں ابو الکلام آزادؔ، کلکتہ میں علاّمہ عمادیؔ حیدر آباد میں مولانا محمد علیؒ دہلی میں اور مولانا شوکت علی بمبئی میں کیوں مقیم ہیں؟ اگر ان سب کے شہر والے ان کی قدر پہچانتے تو کیا یہ شہر سے باہر جاتے، ہاں اپنے ہندوستانی، بھائیوں میں یہ کمال ضرور ہے کہ وہ اپنے ہر کمال و شہرت والے بھائی کی قدر اُس کی وفات سے دو تین سو برس بعد پہچانتے ہیں، جیسے آج حضرات غالبؔ، مومنؔ اور حالیؔ، و آزاد کی پرستش کی جا رہی ہے، جب یہ لوگ جہلم کی حد سے بھی گزر چکے"

علی گڑھ سے آگرہ تک کا ٹکٹ تھرڈ کلاس ہی کا خرید لیا، اب گاڑی آنے میں بھی چند منٹ باقی رہ گئے تھے؛ اور مغرب کی نماز قضاء ہونے میں بھی چند منٹ ہی باقی تھے، اِس لئے ذرا سی گھبراہٹ

کے ساتھ ہم نے ہادی صاحب سے نماز کے لئے جگہ دریافت کی تو فرمایا "پڑھ لیجئے یہیں کہیں" جس کے صاف معنی یہ ہوئے، کہ جس طرح پلیٹ فارم پر ایک ہزار مسافر چل پھر رہے ہیں، اسی طرح آپ بھی چلتے پھرتے نماز پڑھ لیجئے"۔

تو ملاحظہ فرمایا آپ نے مسلمانوں کی نماز سے دلچسپی کو؟ اور بنائیے کالج اور یونیورسٹی جات مجبور ہوئے تو سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں گئے یہاں مسلم یونیورسٹی کے چند مسلمان طلبہ بیٹھے ہوئے تھے ان سے قبلہ کا رُخ دریافت کیا اور کوٹ بچھا کر اِدھر ہم نے نماز شروع کی، اور اُدھر اُن طلبہ نے گفتگو کے شور کو جو کم نہ کیا تو دل ہی جانتا ہے، کس درجہ، صدمہ ہوا یہ سوچ کر کہ مسجد کا احترام تو یہ کہ بے نمازی بھی ہندوؤں کو باجہ نہ بجانے دیں اور نماز کا احترام یہ کہ گفتگو کے شور کو چند منٹ بھی کم نہ کیا جائے تو وجہ یہ ہے کہ یونیورسٹی میں احادیث کا مکمل سبق تو دیا جاتا نہیں، اس لئے خطا ہی کیا ہے طلبہ کی بس یہی شرف کیا کم ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ تو کہلاتے ہیں۔

اب جو ریل آئی تو تھرڈ کلاس میں سوار ہونے کی تمام تکالیف اور ہنگامہ آرائیاں یاد آگئیں مگر فوراً ہی یاد آگئے زعیم الہند حضرت رئیس الاحرار حسرت موہانی جو گزشتہ سال اسی پلیٹ فارم سے ہمارے سامنے

تھرڈ کلاس میں سوار ہوکر کانپور جاتے ہوئے ہم سے مصافحہ فرما رہے تھے، بس تھرڈ کلاس میں خالی جگہ کی تلاش یوں شروع ہوئی، کہ دھکے۔ گھونسے، لاٹھیوں، بستروں، اور مسافروں کو اپنے اوپر سے، ہٹاتے ہوئے ایک ڈبّے میں داخل ہو رہے تھے، کہ یکایک دروازہ ہی میں بیخود سے ہوکر رہ گئے، اِس طرح کہ اندر سے ایک مسافر نے باہر لانے کے لئے ایک بڑا سا صندوق بڑھایا اور باہر سے ایک مسافر نے کوٹ پکڑ کر کہا؛ زنانہ ہے زنانہ، اِس زنانہ سے بچ کر گئے ایک، دوسرے مردانے میں یہاں جگہ ملی اور خاصی ملی، تو اب حضرت وہ ہادی صاحب غائب، جن کے لئے یہ تھرڈ کلاسانہ قربانی کی تھی، پھر باہر آئے، اور اُنہیں تلاش کیا، بیٹھے ہوئے تھے ایک ڈبّے میں بند صندوق بنے، بڑے زور سے کہا چلئے کافی جگہ مل گئی ہے فرمایا اب بیٹھ جائیے یہیں گاڑی جانے ہی والی ہے تو ہم نے زیادہ غصّہ سے کہا امان چلو بھی وہاں خاصی جگہ ہے کہہ رہے ہیں۔ آخر تماشہ ہی تھا اُسوقت کا ہمارا چہرہ جب ہم ہادی صاحب کو اس غرور سے لیکر اپنے ڈبے میں آئے اور دیکھا کہ ہماری اسی بالکل خالی نشست پر ایک چھوڑ تین مسافر یوں آ بیٹھے تھے گویا وہ کئی سال سے اُسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے، نہ پوچھیے اُس وقت ہمارے اور ہادی صاحب کے درمیان

کیا گفتگو ہوئی، بس یوں سمجھ لیجیے کہ سیٹی ہوئی، گھنٹی بجی، اور ریل چلی،
خود کو لکھا پڑھا آدمی سمجھ کر ہم نے کہیں پلیٹ فارم سے دو چار اخبار
بھی خرید لئے تھے، اب جو دو چار اسٹیشن گزر نے پر انہیں اٹھا کر پڑھنا
چاہا تو تھرڈ کلاس کی روشنی نے یہ جواب دیا کہ ہندوستانی جاہل محض ہیں
بس فقط سیکنڈ اور فرسٹ کلاس میں لکھے پڑھے آدمی ہوتے ہیں، اس لئے
تیز روشنی تھرڈ کلاس میں نہیں ہوتی، اور چونکہ ہندوستانی اور ان کے اسمبلی کے
ممبر کبھی ریلوں کے تھرڈ کلاسوں میں تیز روشنی اور بجلی کے پنکھوں کا مطالبہ
بھی نہیں کرتے اس لئے ریلوں کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ان چیزوں کو
اپنے اندر لگا کر سارے ہندوستان میں چلتی رہیں؟

ٹونڈلے کے اسٹیشن پر پھر گاڑی بدلنا تھا اور اسی اسٹیشن پر ڈنر بھی
تھا عرف رات کا کھانا، ہادی صاحب کو تو بنا یا دو منٹ میں گاڑی بدل لی،
اور خود کھانا لانے چلے گئے، اب ایک ایک ڈبا تلاش کیا کہ ہادی صاحب
مل جائیں مگر یوں تو نہ ملے ہاں یوں ملے کہ ایک تاریک ڈبے سے سر
نکال کر چیخے اماں ادھر آؤ ادھر، دروازہ ہی پر سے ہم نے کہا، اور بھئی
روشنی؟ تو جواب ملا کہ اس ڈبے کی روشنی کا تار بگڑ گیا ہے، میں نے
گارڈ صاحب سے بھی کہا تھا انہوں نے کچھ جواب ہی نہ دیا۔ خیر آجاؤ
ڈبا ہے خالی تھوڑی دور تو جانا ہی ہے، آپ ہی فرمائیے کہ گارڈ صاحب

کے انگریزی غرور پرتاؤ کھاتے یا ہادی صاحب کی اس قناعت پسندی پر
کہ ابھی جاؤ ڈبا ہے خالی، بس یہ کہا اور اندر داخل ہو گئے کہ آئندہ سے جب
تھرڈ کلاس میں سفر کرینگے تو ایک لیمپ بھی ساتھ لایا کرینگے۔ کیوں کہ
ان بے حس اور مست لیڈروں سے تو کچھ کہہ نہیں سکتے جو ہندوستانیوں
کی گاڑھی کمائی کو چندہ بنا کر بیٹھے پھرتے ہیں فرسٹ کلاسوں میں، مگر
نہیں کرتے وہ یہ کہ سول نافرمانی کی طرح، وہ کوئی، سول ریلوانی،
بھی کر گزریں تاکہ کچھ تو آرام پائیں، یہ سارے ہندوستان کے کروڑوں
تھرڈ کلاسی"، اب اس تاریک ڈبے.... میں کھانا جو شروع کیا تو
لقموں کا قاعدہ یہ تھا کہ کبھی ہمارے ہاتھ کو ہادی صاحب ترکاری سمجھ
لیتے تھے، اور کبھی ہم اُن کے ہاتھ کو سالن سمجھ لیتے تھے اس لئے کہ سارے
لقمے ایک دوسرے کے ہاتھ پر پڑ رہے تھے، مگر دماغوں کے اس زمینی
اور آسمانی فرق کو ملاحظہ فرمائیے کہ اس حرکت پر ہم تو دے رہے تھے
گالیاں ریل کے مالکوں اور اُن کے غلام ہندوستانیوں سے اس گنوار
قسم کے برتاؤ کو، اور ہادی صاحب ہنس رہے تھے اُن ہاتھوں
پر جو ترکاری کے دھوکے میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، گویا آپ
کے دماغ میں ریل کا یہ اندھیرا تو کوئی اذیت رساں بات نہ تھی صرف
مذاق کی بات یہ تھی کہ دونوں کے ہاتھ ٹکرا رہے تھے، اس لئے اگر ہادی صاحب

ہنس رہے تھے تو کیا خطا کی؟ بس نتیجہ یہ ہوا کہ بغیر پانی پیے پان ٹھونس کر ہم یوں چپ بیٹھے کہ آگرہ تک باتیں تو کیا کیں، بس جو کچھ کہا سراسر خلاف قانون کہا اور کہیں کہیں خلاف تہذیب بھی، مگر کمال یہ کر دکھایا کہ جو کچھ کہا دل ہی دل میں کہا کیوں کہ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ منہ سے بات نکلی اور حرم بن گئی، لیجئے وہ جس طرح ہوا آگرہ آگیا۔ ٹکٹ تھا آگرہ فورٹ کا اور جا کر اُترے، آگرہ چھاؤنی پر، پلیٹ فارم ہی پر ٹکٹ کلکٹر صاحب نے فرمایا کہ مبلغ دو آنے، پیسے اور عنایت فرمائیے، جبکہ آپ آگرہ چھاؤنی کو، آگرہ فورٹ سمجھ کر اُتر رہے ہیں، جی میں آیا کہہ دیں کہ بس تو یہ دو آنے ہمارے تاریک ڈبے میں روشنی بند ہو جانے کے حساب میں منہا کر کے ہمیں جانے دو، مفت،، مگر اللہ رے انگریز کا ڈر کہ کچھ بھی نہ کہہ سکے اور کوٹ کے سارے بٹن کھول کر اندر والی جیب سے دو آنے نکال کر پیش کر دیے اور اُلٹا یہ بھی دریافت کرنا پڑا کہ کیوں صاحب وہ پہلے ہی سے کھچا کھچ بھری ہوئی ریل کب آئے گی اور کونسے پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گی؟ دل ٹوٹ گیا آگرہ کے اسٹیشن پر اس جاڑے میں رات کے ایک بجے قلیوں کو مزدوری میں یوں مصروف پا کر کہ اُن کے بدن پر نہ کوٹ تھا نہ زیادہ روئی کی، نیما آستین، بس پھٹے پُرانے چیتھڑے لگائے تھے سردی سے کانپ رہے تھے اور بھاگے پھر رہے تھے، مسافروں کی

گالیاں کھاتے، بس اس تصور سے آنسو نکل آئے کہ یہی قلی اُن کی اولاد ہیں جو کبھی اسی آگرے اور اسی ہندوستان کے مالک تھے،

واضح ہو کہ ہم نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ فقط آگرہ تک لے لئے تھا، چونکہ یہاں سے شب کے ایک بجے بعد دہلی اکسپریس سے جانا تھا اس لئے ہادی صاحب سے عرض کیا کہ اب اگر حکم ہو تو سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیں، کیوں کہ شب کی وجہ سے باتیں تو کر نہیں سکتے ہاں اگر نیند کی حالت میں بھی آپ باتیں کر سکیں تو پھر ہم حاضر ہیں آپ کے تھرڈ کلاس میں بڑے جوش سے فرمایا ہاں ہاں مُلّا صاحب ضرور سیکنڈ میں جائیے، آپ کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی اور واقعی اب فقط سونا ہی ہے مگر سنئے تو اور وہ صبح؟ یہاں اور وہ صبح کا مطلب یہ تھا کہ ٹکٹ تو خریدیئے سیکنڈ کا وطن تک اور صبح ہوتے ہی آجائیے اسی ٹکٹ سے پھر میرے پاس تھرڈ کلاس میں، ہم نے بھی کچھ سوچ ہی لیا ہو گا، اس لئے ان سے کہہ دیا ہاں ہاں صبح پھر ساتھ تو بڑی خوشی سے فرمایا کہ اچھا تو پھر جائیے جائیے ٹکٹ لے آیئے، گھنٹی ہو چکی ہے بس گاڑی آیا ہی چاہتی ہے مگر دیکھئے صبح بھول نہ جائیے گا!!

بڑا گھمنڈ تھا کہ اب تو سیکنڈ کلاس میں جوانی کی نیند سوئیں گے مگر کسے خبر تھی کہ آنے والی ریل بھی اُنہیں انگریز بھائیوں کی ہے جن کی

رعایا پروری سے پہلے والے تھرڈ کلاس نے مارے آرام و راحت کے کمر کی ہڈی توڑ دی تھی، یہی ہوا، ریل آئی تو بڑے کر و فر سے سیکنڈ میں گئے اور الحمدللہ کہ ایک خالی نشست مل گئی، دونوں لحاف اوڑھ کر بیٹھے اور کوئی شب کے تین بجے تک علی گڑھ پر ایک مضمون لکھتے رہے کہ دن کو دفتر کی، حاضر باشی نے مضمون نگاری کے قابل نہیں رکھا اور پورے چودہ سال سے شب کے تین بجے تک یہ لمبے لمبے مضامین لکھا کرتے ہیں، حالانکہ اب ہو چکے ہیں، بیوی بچوں والے، تین بجے کے بعد بے ہوش سے ہو گئے جسے جاہل لوگ نیند کہا کرتے ہیں اور امیر لوگ۔ آرام، اماں کوئی بجے ہونگے پانچ کہ ایک بڑا جنکشن آگیا کوئی پورے تین آدمی ہماری نشست پر یوں برابر برابر آکر بیٹھ گئے کہ ایک صاحب ہمارے پاؤں ہی پر بیٹھ گئے جس سے ہماری نیند اُڑ تو گئی مگر ہمیں بھی آخر صدیاں ہی گزر گئی ہیں ریلوں میں سفر کرتے اس لئے ہر قسم کی ریلی، ترکیب، ہمیں بھی یاد ہے لہٰذا ہم نے بجی یہ کیا کہ باوجود بیداری کے کروٹ بھی نہ لی اور پڑے رہے آنکھیں بند کئے مگر افسوس ری ہندوستانیوں کی برادر آزاری، کہ سورج، نکلتے ہی ایک صاحب نے ہمیں زور سے جھنجھوڑا اور فرمایا کہ اُٹھئے حضرت اب صبح ہو چکی، یعنی ظاہر کیا کہ ہم بھی سیکنڈ کلاس کے مسافر ہیں

اس لئے اتنا قانون جانتے ہیں کہ ایک نشست پر چار آدمی بیٹھا کرتے ہیں سوتے نہیں، اب فرمایئے کس طرح سوتے، اٹھے اور پشتو زبان میں ان سب کو خاصی گالیاں دیں یہ سمجھے کہ کوئی افغانی آدمی ہے اپنی زبان میں پڑھ رہا ہو گا کلمہ وغیرہ اسی لئے ایک صاحب نے یہ بھی فرمایا خانصاحب کہاں جایئے گا ہم نے کہا "کوفہ"، جایئنگے تو فرمایا خان صاحب "کوفہ" کہاں ہے ہم نے کہا آپ دین پناہ حضور امام حسین علیہ السلام کو جانتے ہیں کہا جی ہاں کیوں نہ جانیں کیا مسلمان نہیں ہیں افسوس کے ساتھ ہم نے کہا تو پھر آپ "کوفہ"، کو نہیں جانتے، تو معقولیت سے کہا کہ مگر آپ کا وہاں جانا یقینی نہیں تھا اس لئے ہمارا خیال ادھر نہیں گیا، ہم نے کہا بلحاظ ناقدر شناسی ہم اپنے دوستوں کے شہروں کو "کوفہ"، ہی سمجھتے ہیں۔

غرض پان، بیڑی، سگریٹ گوس روئی، چائے ہندو پانی مسلمانی والے ایک اسٹیشن پر گاڑی پھر جو کھڑی ہوئی تو یہاں سے پورے پانچ آدمی یہ کہہ کر ہمارے اوپر آبیٹھے کہ صرف ایک اسٹیشن جانا ہے معاف فرمایئے گا، ہمارے ڈبے میں سندیلے کے ایک بوڑھے سے رئیس بھی بیٹھے ہوئے تھے مگر تھے وہ صوبہ "والله" چنانچہ سے کے رہنے والے اس لئے مزاج میں تہذیب اور لیاقت وہ کوٹ کوٹ کر بھری تھی

کہ بس جو وہ زانو ہو کر بیٹھے تھے تو پہلو نہیں بدلتے تھے، اب جو یہ پانچ
مسافر صرف ایک اسٹیشن کا کہہ کر سوار ہوئے تو موصوف کا یہ سندیلوی
دوزانو پن بھی تباہ ہو گیا، لکھے پڑھے تھے یہ پانچوں کسی اسکول
کے اس لئے ان کے پاس مشرقی یا اسلامی تہذیب و متانت کا
پتہ بھی نہیں تھا اس زور سے باتیں کر رہے تھے کہ رئیس سندیلہ ہی کیا
ہم تک دعا کر رہے تھے کہ یا تو وہ ان کا "صرف ایک اسٹیشن" جلد آجائے
یا خدا ہم لوگوں کو ایمان سے اٹھالے" تھوڑی دیر میں ان پانچوں
میں سے ایک نے ایک چھوٹے سے چمڑے کے صندوق سے اپنا پان
کا ڈبہ نکالا، خود کھایا اور ساتھیوں کو کھلا کر رکھ دیا گھبراہٹ میں
ہمارے زانو پر اس پر ہم نے اس ڈبہ کو اٹھا کر کہا اور ملاحظہ فرمائیے
بڑے "شریف حقیف" ہوئے اور فرمایا کھائیے کھائیے ہم نے کہا
آج کل کے "تعلیم یافتہ پن" کی تہذیب یہ ہے کہ، "تھینک یو" ان
کی باتوں کے شور سے زیادہ دماغ سوز تکلیف ان کی باتوں کے
عنوان سے پہنچ رہی تھی یعنی وہی "روشن خیالیت" ان کے دماغ و فتری
معلومات سے اس درجہ ماؤف ہو چکے تھے کہ بس یہ پانچوں ایسے
خاصے "مقدمہ سازش لاہور کی عدالت العالیہ" بنے ہوئے تھے
نے تھک کر رسالہ
تھوڑی دیر میں ان میں سے ایک

دو جن،، لکھنؤ۔ نکالا جو حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر رسالہ نگار نے ایک خاص مقصد کے تحت ابھی ابھی جاری کیا ہے۔ بس اس رسالہ کو ان کے پاس دیکھ کر ان کی ذہنیت اور کور ذوقی کا پورا اندازہ ہو گیا اور سمجھ لیا کہ جو شخص اس عہدِ عقل میں بھی جن اور بھوت کے حالات مزے لے کر پڑھے اُس سے دفتری معلومات اور دفتری گفتگو کے سوا، کانگرس،، کی ممبری، سارہ وابل کی مخالفت غازی نادر خان کے عہد تاجداری،، اور مشرق جدید کی بین الاقوامی سیاست پر اظہار رائے کی اُمید کی جائے۔ پھر بھی رسالہ جن کو ان کے پاس دیکھ کر اتنا یقین آیا کہ یہ بعض دوسرے رسالے بھی کبھی پڑھ لیتے ہوں گے اس لئے ان سے آہستہ سے کہا کہ جنوری کا رسالہ ،، نگار،، ضرور پڑھ لیجئے گا کیونکہ اس میں آپ حضرات کے اس سفر کے حالات پر ملا رموزی صاحب نے کچھ لکھا ہے،، اب تو گھبرائیے اور کہا تو کیا جناب ہی ہیں ملا رموزی ہم نے کہا جی نہیں پہلے اسٹیشن پر ہمیں ایک صاحب نے بتایا تھا کہ اسی ریل میں وہ بیٹھے ہیں ملا رموزی یعنی آگے کے ڈبے میں بیٹھے ہیں اب پریشان بھی ہوئے اور مشکوک بھی نتیجہ یہی، کہ اب ان کی باتوں میں ایک حد تک سلیقہ اور کمی آگئی، اور بار بار یہی دریافت فرمانے کہ

نام سے یاد کریں مگر اُن میں سے جب کوئی ہمیں بربنائے احترام
منشی جی صاحب یہ کہہ کر پکارتا تھا تو بس دل جانتا ہے کس قدر توہین
ہوتی تھی ہماری بیدار مغزی ہماری روشن خیالی اور ہماری چوٹی کی
انشاپردازی کی مگر وہ تو غنیمت ہوا کہ عہد حاضر کے دو چار روشن
خیال تانگے والوں نے ہمیں جو۔ ملا صاحب کہہ کر آواز دی تو کہیں
منشی جی۔ کی تکلیف کم ہوئی، اب جو شہر میں داخل ہوئے تو نہ کوئی
استقبال تھا نہ "زندہ باد رموزی" کے نعرے تھے، نہ پر جوش
معانقے تھے۔ نہ جلوس کے موٹر، بس سڑکوں پر سے گزرنے
والے محض شہری واقفیت کی بناء پر کہیں۔ کہیں۔ ذرا مسکرا کر
سلام کو ہاتھ اٹھا دیتے تھے اس وقت سلام کے ساتھ لوگوں
کے ذرا مسکرا دینے۔ کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ کہیے ملّا صاحب
کہاں گئے تھے بہت دِن سے نظر نہ آتے تھے کہ یکایک سائیکل
پر بیٹھے ہوئے ہمارے چھوٹے بھائی صادق صاحب سلمہ، تانگے
کے پاس آئے بعد سلام مسنون آنکہ بغیر کسی تمہید کے فرمایا کہ گھر
میں تو کوئی بھی نہیں ہے سب بیہور گئے ہیں کل بارہ بجے انتقال ہوگیا
میں بھی رات کی گاڑی سے محض آپ کو لینے آیا ہوں۔
سمجھئے آپ یعنی ہماری خوش دامن صاحبہ کی وفات کی یہ

بتائیے تو جناب کہ ملا رموزی صاحب آپ ہی ہیں باقی کے چاروں نے ملاؔ رموزی صاحب سے ملنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا اور اُن کے مضامین کی بے حد تعریف شروع کر دی اب اس موقع پر ہم نے سندیلوی رئیس صاحب سے جو کہا جناب عالی اِدھر تشریف لے آئیں۔ بڑی تکلیف سے بیٹھے ہیں آپ، تب ان دفتر زدہ لوگوں نے بھی کہا جی ہاں تشریف لے آئیے واقعی ہم لوگوں کے آنے سے آپ حضرات کو بڑی زحمت ہوئی واضح ہو کہ یہ سب ہوں گے کوئی درجہ سوم کے ہندوستانی گمر لباس اور گفتگو میں یہ لوگ آدھے سے زیادہ انگریز ثابت ہو رہے تھے ہر دو سکینڈ کے بعد تین چار انگریزی فقرے اردو میں داخل کرئیے جاتے تھے کہ یہی قابلیت پیدا کر دی ہے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے ہندوستانی استادوں نے اپنے رشید شاگردوں میں

یا وہ شاگرد رشیدوں میں!!

اپنے شہر کے اسٹیشن پر پہنچے تھے کہ کوئی سو سوا سو قلی اور تانگے والے ہمارے اوپر ٹوٹ پڑے اور لگے ہمارے بچپن، جوانی اور ملازمت کے آڑھے ترچھے نام پکار کر ہمیں بلانے، شہر کی واقفیت، ملاقات اور پہچان پر یوں تو ان سب کو حق تھا کہ ہمیں چاہیں جس

اطلاع تھی جو اس طویل سفر سے واپسی پر بطریق "تحفۂ ادب وانشاء" ہمیں راستہ ہی میں پیش کی گئی، اب اور بلا ئیے گاملّا رموزی صاحب کو شاندار جلسوں میں پرجوش تقریریوں اور تنقیدوں کے لئے!

خدائے رحیم و کرم گستر کی بے پایان رحمت سے کامل توقع ہے کہ وہ ہمیں راحت بخش اور عزت افزا سفر بھی اتنے عطا فرمائیے گا کہ ہم تھک کر ڈاکٹر اقبال اور ٹیگور کی طرح تار کے ذریعہ کہہ دیا کریں گے کہ

ابھی فرصت نہیں موسم بہار میں حاضر ہوسکوں گا۔ فقط

کھانسی

بیماری، مرض، علالت، ناسازی مزاج، وغیرہ الفاظ انسان کی اس حالت کے اظہار کے لئے خاص ہیں جب اس کی عام صحت میں کوئی تغیر واقع ہو جائے اور وہ بجائے دفتر جانے کے شفاخانے جانے لگے، یا وہ ملّا رموزی کی کتابوں کا پارسل منگانے کے عوض "دواخانہ یونانی دہلی" کے پارسل منگانے لگے، یا وہ اچھا خاصا "تعلیم یافتہ" اور عقلمند ہونے پر بھی یکایک جامہ انسانیت سے باہر ہو کر جانوروں کی سی حرکات کا مرتکب ہونے لگے، یا وہ دوستوں کے گھر جانے کی جگہ حکیم صاحب کے مطب میں بیٹھ کر کہے کہ اُفوہ حکیم صاحب اب تو مجھے مارے درد کے بیٹھا نہیں جاتا تو سمجھو کہ وہ بیمار ہو گیا ہے۔

لیکن اس بیماری کے ساتھ ہی زبان اردو میں کسی ایسی علامت

کو بھی بیماری کہتے ہیں جو اعتدال اور معقولیت سے ذرا ہٹ کر
ایک مستقل اور مسلسل فعل کی صورت اختیار کرے، مثلاً کسی افیونی
آدمی کا ہمیشہ گردن نیچی کر کے بات کرنا دوا کے قابل بیماری تو نہیں
مگر اصطلاحی بیماری ضرور ہے۔ یا کسی تانگے کے گھوڑے کا ہر وقت
اپنے مکان کے سامنے چلتے چلتے رک جانا، بگڑنا، بدکنا، اور سواریوں
کا سہم کر کہنا کہ بسم اللہ، بسم اللہ، ارے بھئی کیا خراب گھوڑا ہے تیرا،
تو یہ عادت گھوڑے کی بیماری کہلائیگی،

کہتے ہیں کہ بیماریوں میں بیماریاں طاعون، ہیضہ، انفلوانزا،
اور نمونیا، یا پھر، مرگی، مراق، مالیخولیا، اور جنون سب سے نمایاں
بیماریاں ہیں۔ مگر ہمارے خیال میں ان سب کو بیماریاں کہنا صحیح
نہیں جب ان میں بیماری یا مرض کی وہ دلفریب ادائیں نہیں جو
انسان کو یکایک کچھ سے کچھ بنا دیتی ہیں۔ بلکہ یہ تمام حالتیں تو انسان
کو خدانخواستہ، بنانے والی ہوتی ہیں اور جس چیز سے انسان ختم
ہو جائے اُسے موت کہنا زیادہ موزوں ہے۔ نہ کہ مرض یا بیماری،
مثلاً آپ کسی کھانسی کے مریض کو لے لیجئے اور اس کے چہرے،
کو اس وقت دیکھئے جب وہ چند شریف اور ذی اثر لوگوں کے
مجمع میں بیٹھا کھانس رہا ہو!

کھانسی کے وقت انسان پر جو حالت طاری ہوتی ہے اسکی چند صورتیں یہ ہیں۔

۱ بعض حجاب اور غصّے کی وجہ سے دل ہی میں کھانس لیتے ہیں، اور کبھی کبھی بہت خفیف سی "اونھ اونھ"، یا "اخ اخ"، یا "اُخو اُخو"، کی آواز سننے میں آجاتی ہے،

۲ بعض کے دونوں شانے اٹھ کر کانوں تک آجاتے ہیں جب کھانسی پوری ہوتی ہے،

۳ بعض کی کھانسی اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک انہیں مراد آباد کا اگالدان پیش نہ کیا جائے۔

۴ بعض کے نزدیک وہ کھانسی کھانسی ہی نہیں۔ جس کے ترنّم کا سلسلہ مغرب سے صبح کی اذان تک اس طرح جاری نہ رہے کہ ماں باپ تک دعا کریں کہ اے خدایا اسے ایمان سے اٹھا لے یا اس کی کھانسی کو بند کر دے،

۵ بعض لوگ کھانسی میں تال سُر اور نغمہ و موسیقی پیدا کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور مجال نہیں۔ کہ کھانسی کی کوئی آواز وزن ردیف، قافیے اور بحر سے علیحدہ تو ہو جائے مثلاً" اگر کھانسی کا پہلا رکن فعلن فعلن ہے تو کھانسی کی پوری غزل اور اس کا ایک ایک مصرع"

اسی وزن پر ڈھلتا چلا جائیگا۔ بجز اس کے کہ اس غزل کا کف اور
مقطع ذرا ہٹ جائے گا، اس قسم کی کھانسی اکثر باپ کی عمر والے
لوگوں کو ہوتی ہے بیٹے کی عمر والوں کو نہیں، اور اسی لئے اس
کا سلسلہ اِنّا لله والے وقت تک قائم رہتا ہے۔

۶ بعض کھانسی کو مارے تاؤ کے منہ سے باہر نہیں نکلنے دیتے
اور گلا گھونٹ کر یوں کھانسے بیٹھ جاتے ہیں گویا وہ کھانسی سے کہ رہے
ہیں لے اب تو چل۔

اس زور شور کی کھانسی پر خدا ان حکیموں سے سمجھے کہ یہ وہی
۳۰۰۰ شنہ قبل مسیح کے زمانے کا "لعوق سپنتان" عطا فرماتے ہیں جس
کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ چاٹے جائیے اور کھانسے جائیے، اس
قسم کی کھانسی کے شباب کا وقت اکثر نصف شب سے تہجد کی نماز کے
وقت تک رہتا ہے اور یہی وقت گھر والوں اور محلے والوں کے
آرام کا مقرر ہے؛

لطیف کھانسیوں میں کم عمر بچوں کی کھانسی بھی ایک خاص
چیز ہوتی ہے۔ مثلاً شب کے سکون بخش لمحات میں جب ان کی
کھانسی کا نغمہ شروع ہوتا ہے تو آپ آرام سے سو بھی نہیں سکتے
اور انہیں سزا یا بد دعا بھی نہیں دے سکتے پھر اس خواب شکن کھانسی

پر ان بچوں کا ۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رونا چلّانا ایک ایسی لطیف اذیت ہوتی ہے جس میں سارے خاندان کو خواہ مخواہ شریک ہونا پڑتا ہے، ان کی کھانسی میں زیادہ لطف اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب ان کا علاج حکیموں اور ڈاکٹروں کو چھوڑ کر محلّے کی بوڑھی عورتوں سے شروع کرایا جاتا ہے بوڑھی عورتوں کے اس علاج کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ جب وہ ایک جان سے بیزار بچے کی کھانسی کے لئے بتاتی ہیں کہ فلاں درخت کے سبز پتّوں کو جلا کر ان کا دھواں اس کی ناک سے گزار دو انشاءاللہ ابھی کھانسی بند ہو جائیگی اور تجربے کا جو طبّی ثبوت پیش کرتی ہیں وہ یہ کہ میرے بچّے کی کھانسی بھی اسی سے بند ہوئی تھی، بعض کسی پیر کی قبر پر جلنے والے لوبان کی راکھ کھلانا بتاتی ہیں اور بعض کے خیال میں کھانسی کا کوئی علاج مفید نہیں بجز اس کے کہ بچے کو چالیس دن تک اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے کہ کھانسی کا زور چالیس دن کے بعد خود بخود گھٹ جاتا ہے، ایک کھانسی خاندان کے سب سے آخری بزرگ کی ہوتی ہے اس کھانسی میں متعدد لطائف اور حکمتیں مضمر ہوتی ہیں، مثلاً اس کے ہر وقت موجود رہنے کے فوائد یہ ہیں۔

ا رات کو اس گھر میں چور داخل نہیں ہو سکتے جس گھر میں
کوئی بوڑھا رات کو کھانستا ہے۔

۲ دوسرے یہ کہ اگر چور گھر میں داخل بھی ہو گئے اور یہ کھانس
دے تو انہیں عین چوری کی حالت میں فرار اختیار کرنا پڑتا ہے۔
بوڑھوں کی کھانسی گھر کی بے اختیار بہو بیٹیوں کے لئے بھی بے
حد مفید ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں بوڑھے نے کھانسا اور گھر کی الھڑ
اور بے احتیاط بہو بیٹیاں فوراً ہوشیار ہو گئیں، یہی کھانسی اس
بوڑھے کے گھر میں قدم رنجہ فرمانے کا اعلان بھی ہوتی ہی جہاں
انھوں نے دروازے پر "اونھ" یا "اُخو" یا "اخ" کیا اور تمام
عورتیں دوپٹے سنبھال کر بیٹھ گئیں یہ کہہ کر کہ "لو وہ دادا میاں آگئے"
ان دادا میاں کی کھانسی شریر بچوں کے لئے بھی استاد کا کام کرتی
ہے۔ جہاں دادا میاں نے "اُخّو" فرمایا اور بچے سہم کر بیٹھ گئے
یہ کہہ کر کہ ارے واہ دادا میاں ابھی جاگ رہے ہیں۔

گھریلو کھانسیوں میں سب سے زیادہ شاعرانہ کھانسی نوجوان
لڑکیوں کی ہوا کرتی ہے انہیں اگر کھانسی شروع ہو جائے اور
اور گھر میں ایک آدھ مرد بھی بیٹھا ہو تو ان کا مارے حجاب کے
بُرا حال ہو جاتا ہے، یہ کھانسی کو روکنے کے لئے بار بار اپنے منہ پر

ہاتھ رکھتی ہیں یا مکان کے کسی بند کمرے میں جا کر چھپ جاتی

ہیں مگر جب اس پوشیدہ حصے میں بھی کھانسی بند نہیں ہوتی

تو یہ کھانسی پر غصہ کرتے کرتے یکایک اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس

پڑتی ہیں یہ کہہ کر "آگ لگ جائے بند ہی نہیں ہوتی"،

ایک معنی آفریں کھانسی مقرر، واعظ، اور "لیکچرار" کی ہوتی ہے

اس کھانسی کے فوائد بھی بے شمار ہیں مثلاً تقریر کرنے والا اپنی

تمام کمزوریوں کو کھانسی کے پردے میں چھپا لیتا ہے،

کھانسی کے وقفے میں وہ آنے والے مضامین کو سوچ لیتا ہے۔

کھانسی کے وقفے میں اسے پانی منگانے کا قانونی حق حاصل ہو جاتا

ہے، اور اس عرصے میں وہ سامعین کے خوف کو دل سے کم کرتا جاتا

ہے۔ جوں جوں اسکی کھانسی بڑھتی جاتی ہے اس کے ہاتھ پاؤں

کا رعشہ کم ہوتا جاتا ہے، کبھی کبھی وہ اپنی کھانسی میں مسلسل نغمے

پیدا کر کے اپنے آپ کو تقریر کے اہم حصوں سے بچا بھی لیتا ہے

یہ کہہ کر کہ افسوس کھانسی سے مجبور ہوں۔ کل سے بخار بھی ہے

وہ تو آپ حضرات کے اصرار پر میں کھڑا ہو گیا تھا،

گھریلو کھانسیوں میں سب سے زیادہ ذلیل اور شرمندہ

کرنے والی کھانسی وہ ہوتی ہے جو کھانا تناول فرمانے کے

بالکل بیچ میں بغیر کسی تمہید و تقریب کے عین اس وقت چل
جائے جب ایک موٹا سا لقمہ آپ کے حلق میں جا رہا ہوا ور
ابھی جا نہ چکا ہو کبھی کبھی اس موقع پر یہ لقمہ حلق سے یوں باہر
پھینک دیتی ہے کہ پاس بیٹھا ہوا آدمی اس پر آپ
سے لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ مگر خون کا گھونٹ پی کر چپ
رہنا ہے، اور جو کھانسی سے یہ لقمہ باہر آنے کے عوض حلق ہی میں
پھنس کر رہ جائے تو پھر کھانسنے والے کا حال دیکھنے کے قابل
ہوتا ہے اس قسم کی کھانسی کا لطف اِس وقت پورا ہوتا ہے۔
جب آپ کھانسی سے حلق میں پھنسے ہوئے لقمے کو نیچے اتارنے
کے لئے پانی کا گلاس بڑے زور اور اطمینان سے اٹھائیں اور
اِس میں ایک بوند بھی نہ ہو۔
اِسی قسم کی کھانسی سے ملتی جلتی کھانسی وہ ہوتی ہے جب آپ
کسی ذی اثر بزرگ یا حاکم سے ہمہ تن مصروف ہو کر نہایت ادب
سے باتیں کر رہے ہوں کہ یکایک چھالیا کا ایک دانہ آپ کے حلق
میں اُتر کر کھانسی پیدا کر دے اس طرح کہ پھر پوری قوت صرف
کرنے سے یہ بند نہ ہو۔ پھر دیکھئے اس بزرگ یا افسر کے سامنے آپ
کی ندامت کا حال بس جی چاہتا ہے کہ اگر اس وقت یہ کھانسی آدمی

نبکر سامنے آجائے تو اسے قتل ہی کر کے رکھ دوں، یا اس افسر اور بزرگ ہی کو قتل کر کے اپنے سامنے سے ہٹا دوں،

ایک کھانسی افیونیوں کی ہوتی ہے، اس کھانسی میں اگرچہ کوئی خاص شاعری اور لطافت نہیں ہوتی پھر بھی اگر کسی ہوٹل میں آپ کے برابر بیٹھا ہوا کوئی افیونی چائے پی رہا ہو اور اسے کھانسی چل جائے تو پھر آپ ہی اپنی پیالی کو فی سبیل اللہ چھوڑ کر اٹھ آئیں گے مگر آپ سے اس کی کف اور آواز نہ سنی جائے گی اس لئے کہ اس کی کھانسی کی "اُہوں اُہوں" کا خاتمہ نہایت درجہ تکلیف دہ نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔

ایک کھانسی وہ ہوتی ہے جو شکاریوں کے ذوق کی دشمن ہوتی ہے۔ اس کھانسی کا زور اسی وقت ہوتا ہے۔ جب شکار کے سامنے آنے کا وقت ہو جائے، آپ چاہیں کہ شکار کے آنے سے قبل دل کھول کر کھانس لیں مگر وہ تو اُسی وقت شروع نہ ہو۔ اس وقت اس کھانسی کی روک تھام میں خود شکاری صاحب ایک لطیف سا تماشا بن کر رہ جاتے ہیں اور آیا ہوا شکار بھاگ جاتا ہے۔ اس کھانسی کی بدولت کبھی کبھی شکاری کا حلیہ یوں ہوتا ہے کہ بندوق ہاتھ میں آنکھیں شکار پر، اور منہ کے اندر رومال کی گیند،

ایک کھانسی وہ ہوتی ہے جو ریل کے سکینڈ کلاس میں رات کے وقت چلتی ہے۔ اس طرح کہ برابر سونے والے مسافر گردن اٹھا اٹھا کر آپ کو دیکھتے جاتے ہیں اور آپ مارے شرم کے ان کی طرف منہ نہیں پھیر سکتے،

ایک کھانسی وہ ہوتی ہے جو شاعرے ہیں غزل پڑھنے سے پہلے شروع ہوتی ہے۔ یہ کھانسی شروع نہیں ہوتی بلکہ شروع کی جاتی ہے، اس لئے کہ شاعر کی خوشامد کی جائے اور سارا مجمع آپ کی غزل کے لئے سراپا اصرار بنجائے اسی قسم کی کھانسی قوّال کی ہوتی ہے جو قوّالی شروع کرنے سے پہلے کھانسی جاتی ہے اس کا مقصد گانے کیلئے گلا صاف کرنا ہوتا ہے۔

ایک کھانسی غنڈوں کی ہوتی ہے جو کسی راہ گیر کو مخاطب کرنے یا دشمن پر آوازہ کسنے یا اُسے دھمکانے کے لئے کھانسی جاتی ہے یہ کھانسی دکانوں اور بازاروں کے چوراہوں پر کھڑے ہو کر اور ذرا سینہ تان کر کھانسی جاتی ہے اس قسم کی کھانسی پر یہ آجکل کے اسکولوں کے عورت نما فیشن ایبل لڑکوں کو بہت زیادہ تاؤ آتا ہے کیونکہ غنڈوں کی کھانسی اسکول کے لونڈوں کے لئے بھی خاص ہوتی ہے۔

ایک کھانسی جنگل یا رات کے خطرات سے ڈر کر یا خطرات کو دور کرنے کے لئے کھانسی جاتی ہے، ایک کھانسی پولیس کے ڈرپوک قسم کے سپاہی رات کو گشت کے وقت کھانستے ہیں، اس قسم کی تمام کھانسیاں اگر سمٹ کر ایک ہو جائیں۔ تو ان کا نام "دمہ" رکھ دیا جاتا ہے، پھر "دمہ" کے لطائف بجز اس کے کچھ نہیں کہ آدمی نہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا،

ان تمام کھانسیوں میں ایک لطافت خیز نکتہ ان کی مختلف اور رنگا رنگ آوازیں ہیں۔ مثلاً کھانسی کی کوئی آواز اس درجہ شاندار اور زوردار ہوتی ہے گویا کھانسنے والا تمام محلے کے رہنے والوں کو ڈانٹ رہا ہے؛

بعض کی کھانسی کے درمیان اس قسم کے جھٹکے آتے ہیں جن سے اس کے "مرحوم" ہو جانے کا خطرہ اٹل ہو جاتا ہے؛

بعض کی کھانسی کا آغاز نہایت پُرشور ہوتا ہے مگر خاتمہ اس درجہ خفیہ ہوتا ہے کہ سامع خیال کرتا ہے کہ وہ اب کھانس چکا مگر ہوتا یہ ہے کہ کھانسی کی آواز بعد میں اس کے گلے سے اتر کر پیٹ میں جا کر کھانستی رہتی ہے یہ خصوصیت بوڑھوں اور افیونیوں کی کھانسی میں پائی جاتی ہے؛

بعض کی کھانسی اس رنگ کی ہوتی ہے کہ اُسے سنکر کہنا پڑتا ہے کہ یہ شخص کھانسی کو نہیں کھانس رہا بلکہ کھانسی اُسے کھانس رہی ہے۔

اب اگر ان کھانسیوں کے سوا کسی صاحب کو کوئی اور کھانسی ہو تو براہ کرم ملّا رموزی کو مطلع فرمائیں یا براہ راست اس کے پاس آکر سُنا جائیں ؛

ہندوستانی اولاد

اِس امر سے بحث نہیں۔ کہ مُلّا رموزی ابھی صرف ایک ہی ننھے میاں کے والد صاحب ہوئے ہیں زیادہ کے نہیں۔ اور نہ اس جھگڑے میں پڑیئے کہ مُلّا رموزی کو اولاد سے کب تک محبت ہوگی، یہ دیکھئے کہ اب حسب ضابطہ مُلّا رموزی "آل انڈیا والدانیڈ کمپنی لمٹیڈ آف انڈیا" میں شرکت کے قابل ہو گئے ہیں یا نہیں؟ سو ظاہر ہے کہ ہو سکتے ہیں۔ جبکہ اللہ پاک نے اُن کے گھر میں بھی ایک چاند سا بیٹا دیا ہے۔

پس کچھ شک نہیں۔ کہ اِس مضموں سے مُلّا رموزی تمام ہندوستان میں یا بالکل ہی بے وقوف مان لئے جائیں گے یا "حکیم الحکماء" لہٰذا واضح ہو کہ دنیا جہان کے ہر حصّے میں "اولاد سے محبت کرنا"، ایک ایسی یقینی بات ہے۔ جس کا منکر دنیا میں کافر، مشرک، ملحد، مرتد اور جو کچھ بھی نہیں تو گدھا، اُلّو، خبطی، پاگل اور

کم سے کم سی، آئی، ڈی ضرور مانا جائے گا۔ اس لئے ملّا رموزی
بھی "بہ اقرار صالح" کہتا ہے کہ اولاد سے محبّت کرنا مسلّم اور صحیح
مگر کیا یہ محبت کرنے والے کسی ایک کتاب سے بھی ثابت
کر سکتے ہیں کہ اولاد سے اس درجہ محبّت کرنا ضروری ہے کہ دنیا
آپ کو مالیخولیا، مراق، خبط اور دق کا مریض تصوّر کر لے؟ ظاہر
ہے کہ اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ اولاد سے محبّت "بقدر
حماقت" اور بس، لہٰذا چند امور کا تصفیہ بھی ضروری ہے مثلاً یہ کہ

۱. والد صاحب کی محبّت اولاد کے لئے ضروری ہے یا والدہ صاحبہ کی؟

۲. کس حد تک محبّت ضروری ہے؟

۳. ہندوستانیوں میں محبّت کا موجودہ معیار صحیح ہے یا غلط؟

افسوس کہ اوّل تو ہندوستان میں یہ باتیں غور طلب نہیں
مانی گئیں۔ اور جو مانی بھی گئی ہیں تو اس طرح کہ عمل میں کچھ بھی
نہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہندوستانی قوم ہی نہیں بلکہ قومیّت تک برباد
ہو رہی ہے۔ اور کہتے ہیں صرف اتنا آتا ہے کہ اولاد سے محبّت
کرتے ہیں تو کیا گناہ کرتے ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ اولاد سے محبت کرنا انسان کا ایک
طبعی اور فطری جذبہ ہے۔ مگر ہندوستان میں جس طرح محبت

کی جارہی ہے وہ خدا کا کھلا ہوا عذاب ہے۔ چنانچہ مُلّا رموزی کے خیال میں اولاد سے محبت کا مقصد اُس کی حفاظت، پرورش اور اعلیٰ تربیت کے بعد اُس سے پنشن اور کھانسی کے زمانے میں امداد حاصل کرنا ہے یا پھر طبعی منشا یہ کہ انسانی آبادی میں اضافہ ہو اور یورپ میں اولاد سے مقصد یہ ہے کہ جنگی رضاکاروں میں اضافہ ہو تاکہ ایشیا کی قوموں پر حکومت باقی رہے۔ اور اسی لئے یورپ میں مہر، نکاح اور طلاق کا سودا بہت سستا اور ارزاں ہے۔ پس جب اولاد سے مقصد انسانی آبادی کی بحالی اور افزائش ہے۔ تو اس کا مطلب یہ بھی ہونا چاہئے۔ کہ جو لوگ دنیا میں انسانوں کی کثرت سے گھبراتے ہیں انہیں اپنی اولاد کو فوراً ہلاک کر دینا چاہئے۔ لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ اولاد کی کثرت کے مخالفین بھی صبح کے وقت اپنے ننھے میاں کو گود میں لئے ٹہل رہے ہیں۔ اس لئے اب پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ یہ کیوں ہے تو جواب یہ ہے کہ اولاد سے محبت کرنا جہاں ایک طبعی اور فطری ملکہ ہے وہاں اس میں "پراپیگنڈا" یا ایک خیال کی حد سے سوا تبلیغ و شہرت کو بہت زیادہ دخل ہے۔ مثلاً اس وقت سے جب کہ آپ خود کسی کی اولاد کہے جاتے ہیں آپ کے کان، ناک، آنکھ اور جسم کی ایک ایک رگ کو یہ سنایا جاتا ہے

کہ دین و دنیا میں اولاد سے زیادہ پیاری، عزیز، محبوب، لطیف و
نفیس اور کار آمد چیز اب تک پیدا ہی نہیں ہوئی۔ اور اس کی محبت
انسانوں سے لیکر گدھوں، گھوڑوں، کتوں اور مراد آباد کے لوٹوں
تک میں مسلّم ہے پھر یہ آواز اس قدر مسلسل اور متواتر سنی جاتی ہے
کہ آپ کے تمام حواس و خواص اسے بغیر کسی علمی تحقیق اور غور کے
اُسی طرح قبول کر لیتے ہیں۔ جس طرح آپ اپنے مذہب کو بغیر
کسی ذاتی تحقیق کے تمام دنیا کے مذاہب سے بہتر مانتے ہوئے
ہیں۔ اس شدّت کے ساتھ کہ دنیا کے بہتر سے بہتر دماغ بھی اگر آپ کے
مذہب کو جھوٹا ثابت کر دیں۔ تو آپ مان لینے کے بعد بھی اسے جھوٹا نہ
کہیں۔ لیکن اگر آپ اس خیال سے انکار کریں کہ اولاد سے محبّت کرنا کسی
پروپیگنڈا اور تبلیغ کا اثر نہیں ہے۔ تو پھر بتائیے۔ کہ مسلمانوں میں صحابۂ
کرام نے جب جہاد کے میدان میں اپنی اولاد کی شہادت کی خبر سُنی تو
اس پر اظہار مسرّت کیوں کیا؟ یورپین عورتیں جب قومی جنگ میں اپنے
بیٹے کے مارے جانے کی اطلاع پاتی ہیں تو اس پر کیوں اظہار فخر و مسرّت
کرتی ہیں۔ اور یہ آپ کے آج کل سیاسی جنگ کے سب سے بڑے رہنما
موتی لال صاحب نہرو کی صاحبزادی کو عدالت سے جرمانے کی سزا پر
جب کسی گمنام آدمی نے اُن کی رہائی کے لئے جرمانہ داخل کر دیا تو نہرو صاحب

نے اخباروں میں یہ اعلان کیوں کیا کہ میری بیٹی کی رہائی کے لئے جرمانہ

داخل کرنے والا میرا اور ملک کا دشمن ہے؟ پس اِن حالات سے ثابت

ہوا کہ اصل میں جہاد اور قومی وملکی جنگ میں ختم ہونے کو اس درجہ لائق تعریف

کام مشہور کیا ہے کہ اُس میں اولاد تک کو قربان کر دینا دل و دماغ کو

گراں نہیں گزرتا۔ ورنہ کون ہے جو اپنے نوجوان بیٹے کی موت پر اظہار

مسرّت کو پسند کریگا؟ یہی وجہ ہے کہ جب یورپ کی ماں کا بیٹا میدان جنگ

کو روانہ ہوتا ہے۔ تو اس کی ماں اِس کی پیشانی کو فخر سے بوسے دیکر

نصیحت کرتی ہے کہ یا کامیاب آنا یا خود کو قربان کر دینا۔ لیکن ہندوستان

کی والدہ صاحبہ لام پر جانے کی خبر سے خود بھی بے ہوش ہو جاتی ہیں اور

بیٹے بھی اپنی علالت کے بہانے کے لئے ڈاکٹروں سے سرٹیفکیٹ

لکھاتے پھرتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان میں اولاد سے محبت کرنے

کے خیال کو ہندوستان کے شعراء نے بہت زیادہ عام کیا ہے اور شعرائے

ہند نے "ماں کی ماتما" کے موضوع پر جتنا زور صرف کیا ہے اُسے

شائع کرنے والوں نے بھی عقل وخرد اور ادب لطیف کا ایک بڑا

ہی ضروری اور قیمتی باب تصور کرایا ہے۔ چنانچہ شاید ہی کوئی رسالہ

ہو جس میں "ماں کی محبت" یا "ماں کی ماتما" پر ایک آدھ مضمون یا

ایک . . . . آدھ نظم شائع نہ ہوئی ہو اور اب تو تصاویر

کے ذریعہ اولاد کو ماں کے گلے میں لٹکا ہوا دکھایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس شہرت کا نتیجہ ہندوستان کے حق میں یہ نکلا کہ قوم کا ستر کہ اخلاق برباد ہو گیا اور آج دنیا کی متمدن اقوام میں ہندوستانی قوم سے زیادہ بد اخلاق و بدعمل دوسری قوم ہی نہیں۔ اور دنیا میں بد اخلاق و بد عمل قوم صرف تباہی کے لئے باقی رہتی ہے اور بس۔

اخلاق کے بعد اولاد سے حد سے سوا محبت نے قوم کی مالی زندگی اور معاشی حیثیت کو برباد کیا اور آج جو افلاس ہندوستانی قوم میں پایا جاتا ہے۔ وہ دنیا کی غلام قوم میں بھی نہیں۔ اس لئے اس حصہ مضمون میں اولاد سے محبت کے وہ تباہ کن اثرات بتاتے ہیں جو غیر محسوس طریقے پر اخلاق و مالیات سے متعلق ہیں اور یہی اثرات قوم کی سیاسی اور بین الاقوامی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اولاد سے محبت کا سب سے بڑا ٹھیکیدار والدہ صاحبہ کو قرار دیا گیا ہے۔ اور اس معاملہ میں یہ اس درجہ مسلم الثبوت" کردی گئی ہیں گویا دنیا میں والدہ صرف اس لئے پیدا کی گئی ہیں۔ کہ وہ دن رات اپنی اولاد کو گلے میں لٹکائے رہیں۔ اور اس کے لئے آنسو بہاتی رہیں۔ چنانچہ اس خیال کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس تعلیم و ترقی کے زمانے میں بھی آج کل کی ایک ایسی نوجوان، زیرک،

جوشیلی، اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی جس کی بے شمار قوتوں سے بے شمار کام لئے جا سکتے ہیں۔ جماعت اور خانداں کے اِس مسلمہ پراپیگنڈا اور عقیدہ کے اثر سے پہلا بچہ پیدا ہوتے ہی اُس کی یوں عاشق زار بن جاتی ہے کہ اگر اس کے سامنے فرہاد و مجنوں آئیں تو شرمائیں حالانکہ ضابطۂ خردمندی تو یہ تھا کہ جس درجہ بلند اور تعلیم یافتہ خاندان ہو اُس کے افراد و ارکان کے عقلی و علمی اعمال و اثرات بھی دوسروں سے بلند اور لائق تقلید ہوں۔ مگر تعلیم کے غلط اصول کے تحت ہندوستان کے بلند خاندان بھی آج اولاد کے معاملہ میں جس درجہ غلط کار اور سیہ کار واقع ہوئے ہیں شاید ہی غریب خانداں میں اُن کی مثال مل سکے۔

چنانچہ ہندوستان کی ایک صاحب عقل و فراست لڑکی ایام حمل ہی سے ہونے والے بچّہ کے حق میں ضبط کر دی جاتی ہے بس اب یہ لڑکی ہے اور خاندان بھر کی جانب سے اِس کی نازبرداری کا وہ اہتمام ہے کہ الاماں یہ لڑکی ایام ولادت سے جتنی قریب ہوتی جاتی ہے اتنا ہی وہ خود کو نازک ضعیف اور دق کا مریض تصور کرتی جاتی ہے اُس کی نزاکت کے اِس خیالی بھوت کو اُس کی ماں اور ساس خصوصیّت سے زندہ ثابت کرتی رہتی ہے۔ لڑکی اگر اپنی طبعی قوت کے بل پر گھر کے کسی سخت کام کے لئے مستعد ہوتی ہے تو اُس کی ماں اور ساس اُسے

فرضی ڈاکٹری کے لاکھوں قاعدوں سے ڈرتی ہے۔ کہ دیکھو اس
حرکت سے کہیں نہیں کوئی صدمہ نہ پہونچ جائے۔ چنانچہ اس حماقت
آفریں طریق ناز برداری کے عام ہوجانے سے ملّار موزی قسم کے لوگون نے
بھی موقع کو غنیمت سمجھکر ایّام حمل کے لئے ایسے بے شمار اصول تصنیف
کرڈالے ہیں۔ جن کی رو سے عورت کو ہر قسم کی نقل و حرکت ہی حرام قرار
دیدی گئی اور اب اونچے خاندانون کی ایک عورت بھی مزدوروں
کاشتکاروں اور غریبوں کی حاملہ عورتوں کی زندگی اور کام کاج پر نظر
نہیں ڈالتی۔ کہ ان میں کی کوئی ایک عورت بھی حمل کے زمانے مین تجربہ
نہ کرنے کے باعث ہلاک ہوگئی ہو پس مزاجی اور عملی طور پہ جس طرح
اس نخرہ کا آغاز ہوتا ہے اُسی طرح ایّام حمل ہی سے مالی بربادی کا کام
بھی شروع ہوجاتا ہے جس کا معیار حماقت اور دولت پر موقوف ہے
یعنی جس خاندان میں جتنی زیادہ حماقت اور دولت ہوگی اُتنی ہی مالی
بربادی بھی جائز اور مبارک سمجھی جائے گی۔ پس یہ دیکھکر حکیموں اور
ڈاکٹروں کو کیا ہوگیا تھا۔ جو وہ اس حالت سے فائدہ نہ اٹھاتے لہذا
انہوں نے بھی ایسی عورت کے لئے وہ قیمتی اور جواہرات کی تول کے
نسخے گھڑ دیئے۔ کہ بس خریدے جایئے اور دیوالیہ ہوتے جایئے حالانکہ
طبعاً ایسے نسخوں کی اس درجہ گرانی کے ساتھ ہرگز ضرورت نہین جبکہ

ولادت ایک طبعی فعل ہے۔ اور اصول فطرت کے لحاظ سے اس میں ہرگز کوئی خطرہ نہیں۔ مگر رسم ورواج کی شدت وکثرت نے ہر زچہ کے لئے پورا شفاخانہ یونانی خرید لینا ایسا ہی ضروری قرار دیدیا ہے۔ گویا ہر بچّے کے ساتھ ایک شفاخانے کا پیدا ہونا بھی حد سے سوا ضروری اور ضابطہ فطرت ہے!

اس زمانے میں سب سے زیادہ تباہی پھیلانے والی ذات بیوی کی والدہ اور شوہر کی والدہ صاحبہ ہوا کرتی ہیں۔ اور جس خاندان میں دونوں بقید حیات ہیں اس خاندان کی تباہی کا عالم ہی نہ پوچھیے چنانچہ بیوی کی والدہ اس جوش میں کہ میری لاڈلی بیٹی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ اور شوہر کی والدہ اس بےخودی میں کہ میرے لاڈلے بیٹے کے گھر لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔ بچّے والی عورت کو ناز ونخرہ کا جیسا ٹھیٹر بنا دیتی ہیں۔ وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ابھی پیدائش میں تین چار ماہ باقی ہیں اور کہیں ابتدا ہی سے زچّہ اور بچّے کے لئے جو ذخیرہ جمع کیا جاتا ہے۔ اُسے اگر جرمنی فوجوں کا ذخیرہ جنگ یا ذخیرہ رسد کہیں تو غلط نہیں۔ چنانچہ اس موقع پر زچہ کے کھانے کے لئے جو مقوی اور قیمتی ادویہ واغذیہ جمع کی جاتی ہیں۔ اُس پر شوہر صاحب کی اگر تین تنخواہیں خرچ ہو جائیں تو مبارک اور اگر ایک پورا مکان نیلام ہو جائے تو مسعود

اس کے بعد بچے کے لئے جو کپڑے تیار ہوتے ہیں اُن کی حماقت خیز قیمت
کو اگر سرکاری وزیر مال کتابی صورت میں جمع کر دیے تو اتنی طویل ہو کہ اسمبلی
اور پارلیمنٹ کے تین شبانہ روز اجلاس بھی اس کی سماعت سے معذور
رہیں۔ کپڑوں کے بعد گوشت کے اس بچے و حرکت ٹکڑے پر کھلونوں
کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور ماں باپ سے لے کر پورے خاندان اور
سسرال تک کے ایک ایک رُکن پر کھلونوں اور تحفوں کا لانا اتنا
فرض کہ اگر پیدائش سے لیکر پانچ چھ برس کی عمر تک کے "آل انڈیا
بچوں" کے کھلونوں کی تعداد، اقسام اور قیمت کے لئے ایک مستقل
وزیر اطفال مقرر کردیا جائے تو اُسے اپنے کام کے لئے وزیر ہند کے دفتر
اور عملے کے برابر اپنا دفتر اور عملہ تیار کرنا پڑے۔

اس کے بعد پھر وہ عجیب و غریب تقریبات اور رسوم ہیں جن کا
دیکھنا ایک عقلمند انسان پر وہی اثر کرتا ہے جو کم سمجھ بچوں پر بھوت
کا دیکھنا اثر کرتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی مختصر خاکہ ہے مالی بربادیوں
اور عقلی فضولیوں کا۔ اس کے بعد سب سے زیادہ مضحکہ خیز حالت
ہندوستان کے نئے اور تازہ ماں باپ کی ہوا کرتی ہے جو جماعت
اور خاندان کے ارکان کے حماقت آفریں اقوال و اعمال کی ایک
عجیب سی نقل ہوا کرتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ عموماً ہندوستان

میں شادی شروع جوانی ہی میں کر دی جاتی ہے مثلاً بیوی صاحبہ ہوتی ہیں ۱۲ برس کی اور شوہر صاحب ایک کم بیس کے لہٰذا عقلاً طبّاً اور ڈاکٹریاً ثابت ہے۔ کہ اتنی عمر میں نہ لڑکی صورتاً سنجیدہ ہوتی نہ لڑکا متین و باوقار۔ مگر رسم وعقیدہ کا یہ خیالی اثر ملاحظہ ہو کہ جہاں اس عمر کے نوجوان کے ہاں پیدائش کا زمانہ قریب آیا کہ اب دلہن صاحبہ بھی مارے متانت کے ساٹھ برس کی بوڑھی بنی ہوئی ہیں اور دولہا میاں بھی ۷۵ برس کے بوڑھے۔ دلہن صاحبہ ہیں کہ پہلے ہی بچّہ کی محبّت، سنبھال، نگہداشت، حفاظت اور اعلیٰ تعلیم وتربیّت کی اس درجہ ذمہ دار بنی ہوئی ہیں کہ سوختہ کار عورتیں۔ ایک طرف اور دولہا میاں ہیں کہ پہلے ہی صاحبزادے پر یوں نثار وقربان نظر آتے ہیں کہ محلّہ بھر تماشہ دیکھے مگر وہ نہ شرمائیں۔ اگر اس ڈہائی دن کے بچّے نے شروع رات میں کوئی غلط سی کروٹ لے لی تو نئی والدہ صاحبہ ہیں کہ مارے محبّت کے رات بھر بیٹھی رو رہی ہیں۔ اور نئے دولہا میاں ہیں کہ مارے محبّت کے اس پلّے کے لئے جرمنی کے بنے ہوئے ڈاکٹر تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ مگر پورے خاندان میں ایک ایسا نہیں ہوگا جوان نئے نئے ماں باپ کو شرمائے اور کہے کہ ابھی سے آپ کا اولاد پر یوں نثار ہونا موزوں نہیں۔ جبکہ آپ دونوں خود جماعت

اور خاندان کی نظر میں ابھی بچّے دھرے ہوئے ہیں۔ اب جو گھر میں

یہ نئی والدہ صاحبہ چلیں گی تو خاص انداز سے اور گفتگو کریں گی تو خاص

انداز سے۔ بچّہ کو اٹھائیں گی تو لاکھوں دعائیں پڑھ کر اور بٹھائیں گی

تو کروڑوں تعویذ باندھکر۔ والد صاحب بھی بچے کو لیں گے تو بارہ پیار

کرکے اور واپس کریں گے تو سترہ بار خدا حافظ کہکر۔ مگر گھر بھر میں ایک

ذی عقل بھی ایسا نہ ہوگا جو ان دونوں بیاہے ہوئے بچّوں کو ابھی

سے اِس مادرانہ اور پدرانہ بڑھاپے سے باز رکھے۔

اب جو چند دن کے بعد صاحبزادے نے "اوں" اور "آں" کی

آوازیں پیدا کیں۔ تو اب نہ پوچھیے اِن نئے ماں باپ کی مراقی اور جنونی

حالت کا عالم۔ رات اور دِن کا جو لمحۂ فرصت بھی ہے وہ اس صاحبزادے

سے کھیل میں یوں صرف کیا جا رہا ہے گویا خود بھی بہت ہی کم عمر بچّے

ہیں۔ زبانیں لڑکھڑائی جا رہی ہیں۔ منہ بھی بنایا جا رہا ہے اور ہاتھ پاؤں

بھی ہلائے جا رہے ہیں۔ اور اس درجہ اہتمام کے ساتھ کہ نہ اب اپنے

پرانے ماں باپ سے شرم نہ احباب اور محلّے والوں سے حجاب

اور ملّا رموزی نے تو ایسے ایسے احمق بھی دیکھے ہیں جو گوشت کے

اِس سیر بھر کے ٹکڑے کو گود میں لئے ہوئے ہر آنے والے دوست

کو فخر و دیوانگی سے دکھاتے اور مارے پدرانہ دیوانگی کے اِس بچّے

سے زیادہ خود بچّے بنے رہتے ہیں۔ نئے نئے کھلونوں پر کھلونے ہیں کہ آرہے ہیں اور کپڑوں پر کپڑے ہیں کہ تیار ہو رہے ہیں جن کی نہ قیمت کا حساب ہے نہ صحیح مصرف کا اندازہ۔

اس کے بعد اگر خدا نے اس بچّے کو اس قابل کر دیا۔ کہ وہ معمولی سی گفتگو کرے تب تو نئے ماں باپ کی بے ہوشی کا عالم ہی نرالا ہے بس اب اس کی عجیب و غریب تعلیم و تربیت کے قاعدے ہیں کہ تصنیف ہو رہے ہیں۔ دور از کار اور دور از متانت حرکات ہیں کہ سکھائی جا رہی ہیں۔ ایسے موقع پر خاندان کی بوڑھی عورتیں بچّے کو فحش گالیاں سکھانا بہت بڑا پیار تصوّر کرتی ہیں۔ اور نئے ماں باپ دو چار کتابوں کے "تعلیم یافتہ ہوئے" تو اب اس بچّے کی خیر نہیں۔ جہاں گھر پر کوئی دوست آیا یا کوئی سہیلی کہ اب اس خورد سال رنگروٹ کی پریڈ اسے دکھائی جانے لگی اس طرح کہ ہاں بیٹے ذرا جھک کر آداب تو عرض کرو۔

اور ذرا بیٹے مصافحہ تو کرو۔

بھئی ماشاءاللہ ماشاءاللہ

شرماؤ نہیں بیٹا۔ ایک مرتبہ اور۔

اور بیٹے ذرا وہ سنانا جو تمہاری والدہ نے رات کو بنایا تھا۔

اچھا اچھا دیکھو یہ چچا میاں کیا فرما رہے ہیں؟

اور بیٹے ذرا پڑھنا وہ اپنا سبق۔

ذرا اس کا جواب اور دیدو۔

اچھا گھبراؤ نہیں۔ تو ہمارے پاس بیٹھکر صرف ایک مرتبہ اور سنادو۔

اور ہاں بیٹے وہ تمھاری چچی جان منہ کس طرح بناتی ہیں؟

اور وہ نانی جان رات کو کس طرح کھانستی ہیں؟

اور بھئی تو یہ بیبہ بس ذرا ایک مرتبہ چچا میاں کو جھک کر اور سلام کرلو۔

اور بیٹے مزاج بھی دریافت کرلو۔

اور وہ خالہ بی روٹی کس طرح کھاتی ہیں؟

اور ہاں ذرا کہنا کہ آداب عرض ہے۔

اور کہنا کہ مزاج کیسا ہے؟

اور بیٹا کہنا ذرا کہ پان ملاحظہ فرمایئے۔

اور کہنا بیٹا پھر کہ کہاں سے تشریف لائے۔

اور میاں وہ ہنی جان رنڈی کس طرح ناچتی ہیں؟

اور وہ بچّو خاں کس طرح باتیں کرتے ہیں؟

اور بیٹے وہ ریل کس طرح بولتی ہے؟

اور وہ موٹر کس طرح چلتی ہے؟

اور بیٹا وہ تمہارے ماموں جان دفتر کس طرح جاتے ہیں؟

غرض ایک ہزار کرتب ہیں کہ دکھائے جارہے ہیں اور سنائے جارہے ہیں اب آپ چاہے کتنے ہی ضروری کام سے ان والد صاحب کے پاس آئے ہوں اور چاہے اس لونڈے کی حرکت اور صورت سے آپ کو کتنی ہی شدید نفرت ہو مگر والد صاحب ہیں کہ آپ سے جبراً داد دلوا رہے ہیں اور اس کی خوبیوں کو منوا رہے ہیں۔ اور آپ بھی مارے ہندوستانی مروّت کے سبحان اللہ اور ماشاء اللہ فرما رہے ہیں۔ ایسے ہی حمقا ہوتے ہیں جو اتنی عمر ہی میں بچّے کے دماغ کو اپنے حماقت بھرے اسباق سے ایک ایک چھوٹی موٹی سی انسائیکلوپیڈیا بنا دیتے ہیں۔

اس سے بھی کچھ بلند حالت نئی والدہ صاحبہ کی ہوتی ہے چونکہ اس خیال کی بہت زیادہ شہرت ہو چکی ہے۔ کہ دنیا میں اولاد سے جو محبت ماں کی ہوتی ہے اُس کا جواب نہیں والدہ صاحبہ ہیں کہ ہر قدم بسم اللہ اور خدا خیر کرے بنی پھرتی ہیں۔ اب اگر ایسی والدہ صاحبہ کو کسی محفل میں جانے کی سعادت حاصل ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ اب یہ محفل سے اُس وقت رخصت ہونگی جب ایک ایک عورت سے اپنے بچّے کی تعریف کرالیں گی انہیں اس امر سے کوئی بحث نہ ہو گی۔ کہ ان کا بچّہ صورت کے حساب سے کتنا بھونڈا، کتنا گندا اور کتنا الّو کی طرح واقع ہوا ہے یہ تو جب کسی محفل میں

جائیں گی تو اس لونڈے کو حسین و جمیل بنانے میں یوں مصروف ہو جائیں گی۔ گویا یورپ کے حسن کی نمائش میں انہی کا بیٹا اوّل نمبر کا انعام پا کر رہے گا سر سے پیر سرمہ ہے کہ لگایا جا رہا ہے۔ کپڑوں پر کپڑے ہیں کہ پہنائے جا رہے ہیں۔ اور جو اتفاق سے ایسی والدہ صاحبہ کی خدمت میں ایک آدھ ملازمہ اور خادمہ بھی ہے تب تو شاہانہ نخرہ کا عالم ہی نہ پوچھیئے اب یہ بھری محفل میں اس نخرہ سے داخل ہونگی۔ کہ ہر قدم پر ملازمہ کو ڈانٹا جائے گا۔ اس طرح کہ دوسری عورتیں بھی سُن لیں اور دیکھ لیں کہ ہاں یہ بیٹے والی بھی ہیں اور "امیر آدمی" بھی۔

دیکھ دیکھ اندھی تیرے ہاتھ کے نیچے میاں کا ہاتھ دیا ہوا ہے۔

تو بے غیرت کبھی سنبھالا بھی ہے بچّوں کو۔

لے جا ذرا باہر جا کر کھلا انہیں۔

اور دیکھ اگر رلایا ہے۔ تو تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

لے یہ کھلونے تو لے ان کے۔

بس بس لیجا جلد میں ذرا ان سے باتیں کرتی ہوں۔

اتنے فقرے ملازمہ سے محض محفل کو سنانے اور دکھانے کے لئے کہے جائیں گے۔ اور دل میں یہ جوش بھرا ہوگا۔ کہ بجائے ملازمہ کو دینے کے بیٹے کو خود ہی گلے کا ہار بنائے رہوں۔ چنانچہ بچّے کے روتے ہی بڑے نخرہ سے ملازمہ سے لیا جائے گا۔ اور محفل کے ایسے رُخ بیٹھکر اُسے دودھ پلایا جائیگا جہاں

سے محفل کی تمام عورتیں آپ کو اولاً دیکھ لیں۔

اب جو دودھ پلا کر فارغ ہوئیں۔ تو تمام محفل کی شامت آگئی جو عورت آپ سے مخاطب بھی نہیں ہے اُسے اپنی بے حیائی سے خود ہی مخاطب کیا جائے گا۔ اور اپنے لاڈلے کے کرتب دکھائے جائیں گے۔ اور اپنے سے زیادہ شوہر صاحب کے عشق کا اظہار کیا جائے گا۔

سلام کرو بیٹے یہ تمہاری نانی امّاں ہیں۔

اور انہیں بھول گئے انہیں۔ ارے بے وقوف یہ تیری دادی جان ہوتی ہیں۔

اور انہیں یہ اپنی یہ خالہ بی ہیں بے ہودہ، ارے یہی تو تیرے لئے جوڑا لائی تھیں۔

اچھا میاں ذرا خالہ بی کو ڈانٹ تو دو۔

اور ذرا میاں آداب تو عرض کر لو جھک کر۔

اِس قسم کی مضحکہ خیز پریڈ کے بعد اب یہ نئی والدہ صاحبہ اِس لاڈلے کے حالات وخواص کی تفصیلات اور اپنی اور اپنے شوہر صاحب کی اِس سے محبت کی داستان شروع فرمائیں گی۔ اور انہیں یہ خیال ہر گز نہ ہوگا۔ کہ سننے والی عورت ان حالات کو پسند بھی کرتی ہے یا دِل میں مبرا مذاق اُڑائیں گی۔ مگر یہ ہیں کہ بچے کی تعریف میں رواں دواں ہیں۔

بہن کیا کہوں تم سے کہ میں نے اِس بچے کے لئے کیسی کیسی تکالیف اٹھائی ہیں، خدا عمر دراز کرے اِس کی آپ ذرا سُنئے کہ جب یہ تین مہینے کا پیٹ میں تھا تو

مجھ اندھی کو ہوش تو رہا نہیں میں "وہ" ان ہی کے ساتھ موٹر میں بیٹھکر ٹھنڈی سڑک پر چلی گئی۔ وقت تھا سخت جاڑے کا بس مجھے کھانسی ہوگئی۔ اسی وقت سے بس خدا جانے کیا اثر ہوا کہ پیدا ہوتے ہی اُسے بھی جو کھانسی ہوئی ہے۔ تو جانے کا نام نہیں لیتی۔ مگر خدا انہیں بھی سلامت رکھے۔ کہ انہوں نے اس کے علاج کے لئے زمین آسمان تو ایک کر دئے ہیں۔ کونسا حکیم ہے کونسا ڈاکٹر ہے جس کی دوا انہوں نے اسے نہ دی ہو۔ بس اب میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اسے یورپ لے جاؤں گی اور جو کچھ بھی خرچ ہو وہاں اس کا علاج کراؤں گی۔ کیونکہ دولت کی تو مجھے پرواہ نہیں۔ بس خدا اُسے اچھا کر دے۔ کیونکہ بہن حق تو یہ ہے کہ مجھ سے سوا تو انہیں اس سے محبّت ہے۔ اب جو میں یہاں آگئی ہوں۔ تو بس دیکھ لینا کہ "وہ" اس کے لئے بے چین ہو رہے ہوں گے۔ کیا مجال جو گھر میں اسے تنہا چھوڑ کر میں ایک منٹ تو علٰحدہ ہو جاؤں۔ بس گھر کو سر پر اٹھا لیتے ہیں کہ دیکھو تم ہو بد احتیاط تمہارے ہو جانے سے خدانخواستہ میرے بچّہ کو کوئی نقصان پہونچ گیا تو ؟

اور بہن کیا کہوں میں تم سے اِس شریر کی حرکتوں کا حال ماشاء اللہ جہاں صبح کی چڑیاں بولیں اور اس نے کھیلنا شروع کیا۔

بہن میں تو ہوتی ہوں اُس وقت غافل بس خدا انہیں میرے سر پر ہزار برس رکھے وہی اٹھتے ہیں اور لیمپ کے سامنے لیکر لیٹ جاتے ہیں کبھی گود میں

لیکر ٹہلتے رہتے ہیں۔

کہنے کو ابھی یہ پانچ مہینے کا ہے مگر ماشاء اللہ اتنا ذہین ہے کہ کتنا ہی چیخ رہا ہو مگر جہاں میری آواز سنی کہ بس فوراً ہی خاموش ہو جائے گا۔

یہی حال اس کی دادی اماں کا ہے۔

بہن حق یہ ہے کہ وہ بھی اس پر جان نثار کرتی ہیں۔ گو اُن کی ضعیفی کا زمانہ ہے۔ مگر رات بھر ہیں کہ اپنی گود سے علیحدہ نہیں کرتی ہیں۔ غرض گھر بھر ان میاں پر قربان ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہے ایک حد سے سوا مختصر نمونہ "ہندوستانی اولاد" کا جو تقریباً ہر گھر میں موجود ملتا ہے۔ پس اس قسم کی اولاد کے اندر جو خواص و اثرات پیدا ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ مردانہ اور مجاہدانہ جذبات کی جگہ نسوانی اور بزدلی کے جذبات بیدار ہوتے ہیں جیسی یہ آج کل اسکولوں اور کالجوں کی نسل نظر آرہی ہے۔

۲۔ ایجاد و اختراع کی جگہ نقل و تقلید کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ ترقی اور برتری کے عوض قناعت اور غلامی کے خیالات مضبوط ہوتے ہیں۔

۴۔ ہنرمندی اور مشقت کے عوض سہارے اور معاون پر بھروسہ کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ ترک وطن اور کسب عزت کے لئے سفر کرنے سے خوف پیدا ہوتا ہے۔

اور اسی لئے میدان جنگ جاتے وقت یورپ کی ماں خوش ہوتی ہے اور ہندوستانی والدہ کے ساتھ لام پر جاتے وقت بیٹا بھی لپٹ کر روتا ہے۔

۶۔ بد اخلاقی و بد اعمالی کا ولولہ ہر وقت پُرجوش رہتا ہے۔

۷۔ وفا اور استقلال کی قوت فنا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ قوتیں تکالیف کی برداشت سے پیدا ہوتی ہیں اور یہاں پرورش کی جاتی ہے ناز و نخرہ سے۔

اس کے بعد مرتبہ آتا ہے اولاد کے لئے منت، مراد، تعویذ، گنڈے، پیر صاحب، عرس اور خیرات و صدقات کی عجیب عجیب تفصیلات کا جس کے لئے آپ ملا رموزی صاحب کی کتاب "بیٹا بیٹی" ذیل کے پتے سے طلب کیجئے۔

غُصّہ

غصہ بظاہر تو ساری دنیا کے نزدیک ایک مکروہ اور قابل نفرت چیز ہے۔ مگر فنی اور علمی نظر سے اس کے اندر جو حُسن و خوبی پوشیدہ ہے اُس سے انکار کرنا بھی نہایت شدید جہالت ہے۔ مثلاً ایک صاحب علم و بصیرت انسان کے لئے غصے والے کی بگڑی ہوئی صورت اور اُس کا یکایک جامۂ انسانیت سے باہر ہو جانا جس درجہ لطیف تماشہ ہے اتنا تھیٹر کا تماشہ بھی نہیں۔ غصہ کا یہ حسن کیا کم ہے کہ غصہ کرنے والا تو غصے کی آگ میں جلے اور دیکھنے والا مارے قہقہوں کے بے تاب ہو جائے؟

غصے کی پیدائش کا سبب انسان کے مزاج کا اتار چڑھاؤ ہے بعض حضرات میں یہ دولت فطرت ہی سے ودیعت ہوتی ہے مگر بے سبب اُسے فطرت بھی قبول نہیں کرتی مثلاً اور کچھ نہیں تو آپ فطرۃً سوکھے جلے ہوئے اور شکنجے میں کسے ہوئے بدن ہی کے واقع ہوں گے تو یہ دولت آپ کی رگ رگ

سے ٹپکتی رہیگی یعنی جو شخص جتنا زیادہ دبلا پتلا اور لاغر، یا خشک مزاج ہوگا

اتنا ہی زیادہ غصہ اس کی ناک کے سرے پر موجود ملے گا، غصہ کا سب سے

قوی محرک انسان کی قوت حاسہ ہے پس جو شخص جتنا زیادہ ذی علم، ذی حس

اور عقلمند ہوگا اتنا ہی زیادہ غضبناک اور مشتعل مزاج ہوگا لیکن اس کے یہ

معنی نہیں کہ پھر دنیا کے تمام۔ مدبرین، وزرا، بادشاہ، اور علمائے کرام ہی کو ہر

وقت آپ سے باہر رہنا چاہیئے کیونکہ یہی لوگ سب سے زیادہ ذی ہوش اور صاحب

عقل ہوتے ہیں بے شبہ انہی لوگوں کو سب سے زیادہ مشتعل مزاج رہنا چاہیئے

تھا مگر ایسا جو نہیں ہوتا سو اس لئے کہ ایسے لوگوں میں عقل و تمیز کے باعث

غصے کے نتائج سمجھ لینے کی قوت بھی سب سے زیادہ پیدا ہوتی ہے، اس لئے

ان لوگوں کے غصہ کو ان کی مآل اندیش قوت ہر وقت شکست دیتی رہتی ہے

مثلاً جہاں کسی تعلیم یافتہ کو غصہ آیا اور معاً اس کے سامنے سی، آئی، ڈی، کوتوالی،

حوالات، سپاہیوں کے گھونسے، چالان، عدالت، پیشی پر پیشی، جرح، قید با

مشقت حبس دوام بعبور دریائے شور، جلاوطنی، اور پھانسی جب تک کہ دم نہ

نکل جائے والے خطرات آجاتے ہیں اور اس کی قوت قہر و غضب ان سے

مرعوب ہو کر رہ جاتی ہے، بخلاف کسی تعلیم یافتہ اور ذی ہوش انساں کے کسی

غنڈے کے غصے سے اللہ پاک "عالمگیر" کے ہر خریدار کو محفوظ رکھے اس لئے

کہ غصہ کے عالم میں غنڈے کے سامنے بس گالی، گھونسہ، جوتا، لٹھ، اور تلوار، تو

ہوتی ہے مگر کوتوال صاحب نہیں ہوتے، پھر ڈر کا ہے کا؟

غصہ اصل میں ایک نہایت شریف قوت ہے جس کا دوسرا نام قوتِ مدافعت ہو سکتا ہے، اور اِس کا بقدرِ اعتدال ہر انسان میں ہونا انسانیت کی تکمیل ہے مثلاً اسی قوت سے انسان جرمنی کی فوجوں کو اپنے شہر میں داخل ہونے سے روک سکتا ہے، اِس سے وہ اپنے خاندان اور اپنی عزت کی حفاظت کر سکتا ہے وہ اِس سے اپنے مذہب کو بچا سکتا ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جنکی حفاظت انسان کا شریف ترین وظیفۂ حیات ہے لیکن جن لوگوں سے غصہ کی قوت کم ہو جائے سمجھو کہ وہ بے حیائی، بے شرمی، اور ذلت و خواری کی ہر حالت کو قبول کر سکتا ہے اور جب ذلت کو قبول کر سکتا ہے تو اِس کی موت بھی یقینی ہے، جیسے زنانِ بازاری، یا آج کل کے اسکولوں کے فیشن ایبل لونڈے جن کے لباس کی آرائش اور نسوانی فیشن نے اِن کے مزاجوں میں غصہ کے عوض نزاکت اور لکھنؤ کا "واللہ چنانچہ ہین" پیدا کر دیا ہے، اور اسی لئے وہ ہر جگہ ذلیل ہیں۔

یہ قوت سرحدی پٹھانوں ہی کے لئے خاص نہیں بلکہ یہ عربستان کے اونٹ اور ہندوستان کے گدھوں میں بھی موجود ہوتی ہیں مگر اللہ تانگے کے گھوڑے کو غصہ کی حالت میں نہ ملائے خصوصاً اس وقت جب وہ بیچ چوک میں غصہ فرما رہا ہو اور وہ جو ہم نے اوپر لکھا ہے کہ غصہ اصل میں مدافعت کی

نخوت کا نام ہے سو تانگے کا گھوڑا اپنی پچھلی ٹانگوں سے اسی وقت غصہ کرتا
ہے جب ٹانگے والے نے بجائے تین کے چھ سواریاں بٹھالی ہوں اور
گھوڑے پر ہنٹر کا مینھ برساتا جاتا ہو،

اظہار غضب کے لئے ہمیشہ جسمی اعضا سے کام لیا جاتا ہے اور انسانی آلات غضب میں سب سے زیادہ تیز آنکھ اور ناک کے نتھنے ہیں جنہیں غصہ کی حالت میں "تیور" کہتے ہیں لیکن اگر کسی انسان کے کان بھی غصہ کا اظہار کر سکیں تو سمجھو کہ وہ جانور بھی ہے۔ کیونکہ جانوروں کے اظہار غضب کے لئے کان سب سے زیادہ نمایاں آلہ ہیں۔ پھر پیشانی، اور ہونٹ کام کرتے ہیں لیکن غصہ کے اظہار کے لئے جب انسان کی زبان اور ہاتھ کام کرنے لگیں تو بس اس وقت خدا ہر شریف آدمی کو اس سے محفوظ رکھے۔

غصے کے نتائج یہ ہیں،
پسینہ کا زیادہ آنا۔ ہاتھ پاؤں اور سانس کا ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کام کرنا تمام کپڑوں کا نہیں تو دامن یا گریبان کا پارہ پارہ ہو جانا پھر جس شخص پر غصہ کیا جائے اس کی پہچان یہ ہے، آنکھوں سے آنسوؤں کا جاری ہونا،
کپڑوں کا جگہ جگہ سے پھٹ جانا،

خاک کے نشانات سے کپڑوں پر نقش و نگار کا اُبھر آنا
کوتوالی کی طرف جاتے ہوئے نظر آنا
سر سے خصوصاً اور دوسرے اعضا سے عموماً خون کا جاری ہو جانا۔

پس ان حالات کے ساتھ جو شخص نظر آئے سمجھو کہ اس پر کیا گیا ہے، یہ تو تھیں غصے کی تعریفات اور علامتیں اب یہ معلوم کیجئے کہ غصہ کب اور کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ سو سب سے پہلے یہ پیدا ہوتا ہے آپ کی ذاتی کمزوری، خطا، اور غلط کاری سے، مثلاً کوئی شخص بھرے مجمع میں آپ کی کسی خطا کا اظہار کر دے، یا آپ کی کمزوری کو آپ کے منہ پر کہدے۔

مثلاً کوئی شخص کسی کوتوال سے کہدے کہ آپ جو مجرم کو رات بھر مارتے ہیں سو اس لئے نہیں کہ وہ جرم کا اقبال کرلے بلکہ اس لئے کہ آپ کو رشوت دیدے تو مان لیجئے کہ کوتوال صاحب کو آپ پر غصہ آجائیگا۔

آپ کسی تحصیلدار سے کہدیں کہ آپ تحصیل وصول کرنے کے لئے کسانوں کی گاڑیوں میں کیوں سفر کرتے ہیں اپنے باوا کی جائداد سے گاڑی کیوں نہیں خریدتے تو تحصیلدار کو غصہ آجائے گا۔

آپ کسی ماسٹر یا پروفیسر سے کہدیں کہ آپ نے اسکول میں
کوٹ پتلون پہنکر ہندوستان کے قومی لباس کو فنا کرنے میں
بہت زیادہ حصہ لیا ہے تو اُسے غصہ آجائیگا،
آپ کسی اسلامیہ کالج کے بی اے، یا ایم اے، پاس لونڈے
سے کہہ دیں کہ جب تو کہیں کا افسر ہو جاتا ہے تو اپنے ماتحت
ملازمین کو اپنے گھر کے گدھے سمجھتا ہے تو اُسے غصہ آجائے گا،
آپ کسی شاعر سے بھرے مشاعرہ میں کہہ دیں کہ آپ جو غزل
پڑھ رہے ہیں وہ آپ کی نہیں بلکہ ملا رموزی صاحب کی کہی ہوئی
ہے تو اُسے غصہ آجائے گا
آپ کسی سیماب اکبر آبادی اور کسی ساغر علی گڑھی سے
کہیں کہ آپ کو نہ صحیح اردو لکھنا آتا نہ صحیح شعر کہنا تو اِن دونوں کو
غصہ آجائیگا،
آپ کسی پروفیسر سے کہدیں کہ نوجوان طلبہ میں نسوانی لباس
اور نسوانی نزاکتیں پیدا کرنے میں آپ لوگوں نے بہت زیادہ
حصہ لیا ہے تو اِن سب کو غصہ آجائے گا،
آپ کسی حاکم عدالت سے کہدیں کہ جو وکیل آپ کے بنگلہ پر زیادہ
آتا جاتا ہے آپ اسی کے ذریعہ رشوت وصول کرتے ہیں اور خدا

کے بے گناہ بندوں کے مقدمات برباد کرلے ہیں تو انہیں غصہ آجائے گا،

آپ جس کے ملازم ہوں اُس سے کہدیں کہ میں تجھ سے ہر طرح زیادہ قابل ہوں مگر ملازمت کی وجہ سے تجھے جھک کر سلام کرتا ہوں تو اُسے غصہ آجائے گا،

اِن غصوں کے بعد دنیا کے بعض خطرناک غصے یہ ہیں جنہیں اجتماعی غصے کہہ سکتے ہیں۔

چنانچہ سب سے زیادہ خطرناک غصہ قومی اور ملکی غصہ کہلاتا ہے یہ غصہ کبھی کسی خودغرض بادشاہ یا خودغرض حاکم سے شروع ہوتا ہے اور وزراءمیں سے کسی ایک وزیر سے پھر اُسے علماء، مقررین، مضمنین، اخبارات اور اشتہاروں کے ذریعہ ساری رعایا میں پھیلا یا جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے یہ قومی غصہ جرمنی کی لڑائی مشہور ہو جاتا ہے، یا فرض کیجئے کہ مسٹر گاندھی، موتی لال نہرو، مولینا ظفر علی خاں مولینا حسرت موہانی اور مُلّا رموزی کو انگریز بھائیوں پر غصہ آجائے تو اس کا نام "سوراج" رکھدیں گے۔ اِس قسم کے غصوں کا نتیجہ دوقوموں کی بربادی ہوا کرتا ہے پس اس قسم کے غصوں کو یورپ

سے دور رکھنے کے لئے شہر جنیوا میں ایک انجمن بنائی گئی ہے جسے ہندوستانی "جمعیتہ الاقوام" کہتے ہیں، یہ انجمن یورپ کے اجتماعی غصوں کو روکنے کا کام کرتی ہے، اس مجلس کے مقابل انفرادی غصوں کو روکنے کے لئے ہندوستانی لوگ ذیل کے الفاظ سے کام لیتے ہیں

بس بس جانے بھی دیجئے،

چلئے چلئے آپ تو گھر جائیے،

بے شبہ یہی نالائق ہے،

چلئے دو باتیں آپ ہی سن لیجئے،

بھئی تمھیں امام شہید کی قسم جواب بولو،

لاحول ولا کہہ تو رہے ہیں کہ وہ آپ سے معافی مانگ لیگا، اماں ہو کیسے یہ تمام لوگ تماشہ دیکھ رہے ہیں، اور جو تم نے اسے جوتا پھینک کر مار دیا تھا تو ہ چلئے بس برابر ہو گئے،

اماں سنو تو اچھا ادھر تو آؤ،

استغفر اللہ اگر آپ ہی چپ ہو جائیں گے تو کیا قیامت آجائے گی،؟

انفرادی غصوں میں سب سے زیادہ مہلک تباہ کن اور ملعون دولتمند یا حاکم کا ہوتا ہے ان لوگوں کے غصہ کے لئے کوئی ضابطہ اور قانون نہیں جب چاہا اور جس کے کہنے سے چاہا غصہ شروع کر دیا۔ پھر جب تک چاہا کسی سے خوش رہے اور جب چاہا غصہ فرما بیٹھے ان لوگوں کے غصہ میں گالی، تو تڑاق،

مار پیٹ، اور "ابے جا تُس سے ڈرتا کون ہے" وغیرہ الفاظ صرف نہیں کئے جاتے، بلکہ جس پر اِن لوگوں کو غصہ آجاتا ہے اُسے نہایت خموشی سے موقوف، برطرف، علیحدہ، یا قید کر دیتے ہیں، اِس قسم کا غصہ اِس عہد علم و بیداری میں بھی کیا جاتا ہے مثلاً ایک افسر اپنے ایک ماتحت سے گیارہ برس کی ملازمت کے بعد اگر غصہ ہو جائے یا اُس پر غصہ کرے تو اس کے لئے لکھدے گا کہ یہ ملازم کاہل، غیر حاضر گستاخ، اور چور ہے اِس لئے موقوف کیا جاتا ہے مگر کوئی نہ پوچھے گا کہ اور یہ اوپر کے گیارہ برس میں اس کے اندر یہ خرابیاں کیوں نہیں تھیں؟ جبکہ ہر ماتحت کے خواص اور اعمال کے اندازہ کے لئے چھ مہینے کی مدت کافی ہے۔ اور اِسی قسم کی موقوفی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ انتظام انصاف نہیں بلکہ افسر کا غصہ ہے،

سب سے آخری یا خطرناک غصہ بیوی کا ہوتا ہے خواہ یہ بیوی کسی رئیس کی ہو یا کسی فقیر کی، اِس کا غصہ نہایت میٹھا، نازک، خفیہ، بلکہ انواع و اقسام کا ہوتا ہے جسے عقلمند خاوند کے سوا کوتوال صاحب بھی نہیں سمجھ سکتے بیوی کے غصہ کے اسباب نہایت غیر قانونی عقل و خرد سے کوسوں دور اور اکثر نہایت غیر منصفانہ اور غیر شریفانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی دن آپ بیوی کی اجازت کے بغیر خواجہ حسن نظامی مدظلہ کے ہاں قوالی میں چلے جائیں اور وہاں سے بارہ تیرہ بجے رات کو گھر واپس آئیں تو یہ غصہ فرما بیٹھے گی، پھر یہ اشارۃً کنایۃً یا الفاظ کے ذریعہ اپنی بیوی کے کان تک اتنی بات پہونچا دیں کہ مجھے تیرا کالا

رنگ پسند نہیں تیری آنکھ ذرا ترچھی ہے تو گندی اور کاہل ہے تیرے ہاتھ کا سالن لذیذ نہیں ہوتا. تیرے اندر تہذیب و سلیقہ ہے تو مگر کم کم، تو صبح بہت دیر میں سو کر کیوں اٹھتی ہے، تو کلب اور ٹھنڈی سڑک پر جانا ترک کردے، تو اپنے ماں باپ کے ہاں مہینوں کیوں رہا کرتی ہے وغیرہ۔

غرض اس بیوی کے غصہ کا نہ کوئی وقت ہے نہ کوئی ضابطہ نہ کوئی مقصد ہے نہ قرینہ وہ جب چاہے گی غصہ کرے گی اور جس طرح چاہیگی غصہ کرے گی بس اُس پر جہالت کا غالب آتا شرط ہے پھر اُس کے غصہ میں دیر نہیں، پھر جب بیوی کو غصہ آجائے تو اُسے نہ شہر کا کوئی موٹے سے موٹا کوتوال ڈرا سکتا ہے نہ سفید سے سفید ڈاڑھی والا قاضی، پھر ستم پر ستم یہ کہ بیوی کا غصہ کبھی سیدھا نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ ترچھا یا الٹا ہوا کرتا ہے مثلاً اُسے غصہ تو آئے گا شوہر پر مگر اُس کا اظہار کرے گی گھر کے برتنوں پر یا وہ گالی تو دے گی شوہر کو مگر مخاطب کرے گی اپنے گود کے بچہ کو، وہ اگر آپ کی وفات کے لئے دعا کرے گی تو یوں کہے گی کہ "اللہ مجھے موت کیوں نہیں دیتا" اسی طرح وہ اپنے بچہ کو تنہائی میں تو پیار کریگی مگر شوہر کے سامنے اُسے مار کر کہے گی کہ "تو مر کیوں نہیں جاتا" وغیرہ

غرض دعا کیجئے کہ اللہ ہمیں آپ کو اپنی اپنی بیویوں کے غصے سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔

نمائش

اس نمائش سے وہ نمائش مقصود نہیں جس میں نہایت حسین اور خوبصورت بازاروں کے لئے شہر اور قصبات کے دکانداروں کی "سرکاری شامت" آجاتی ہے اور نمائش کے منتظم لوگ کسی دکاندار سے یوں مخاطب نظر آتے ہیں کہ

ابے تیرے باوا کو دکان لیجانا پڑے گا نمائش میں
اور یہ جو حکم آیا ہے کلکٹری سے تو اُسکی تعمیل تو کریگا یا ہم
تو کہہ تو رہے ہیں گنوار تجھ سے کہ ہاں صرفہ بھی ملیگا صرفہ
اچھا تو بس سمجھ گئے ہم کہ تو بغیر جوتے کے نہ جائے گا۔
ارے بھئی مرا کیوں جاتا ہے بس ایک ہفتہ کی بات ہے
اور دیکھ وہ ملا رموزی صاحب تک کی دوکان موجود ہے وہاں، پھر

کیا اُنہیں صرفہ نہ ملا ہوگا،

ابے اُلّو وہاں صاحب ملاحظہ فرمائینگے تیری دکان کو اور انعام دینگے

پھر وہی بک رہا ہے،

لاحول ولا

اماں ہیڈ صاحب ایک طمانچہ تو مارو اس مردود کے مُنہ پر،

ابے کہہ رہے ہیں کہ اب وہ مُلّا رموزی صاحب کا زمانہ گیا اب

ہمارا انتظام ہے وہاں،

بس تو ٹھیک دو بجے دفتر سے گاڑیاں آجائیں گی،

بھیّا سامان لادو دینا، دام دلانے کا ذمہ ہمارا،

اور نہ اس نمائش سے وہ علی گڈھ کی نمائش مقصود ہے، جس میں شرکت کے لئے تو بھی چل میں بھی چل یہ بھی چل وہ بھی چل، طلبہ بھی حسینوں کا لباس پہنکر چل، چپراسی بھی چل اور تو اور وہ پروفیسر لوگ بھی ٹینس کا بلّا ہاتھ میں لئے کھیل سے سیدھے اس نمائش میں "چل ہو جاتے ہیں" پھر خریداری کا یہ عالم کہ یہ بھی خرید وہ بھی خرید اسے بھی خرید اُسے بھی خرید، اور بس چلے تو ایک چھوڑ دس مُلّا رموزیوں تک کو خرید لیں،

اور نہ وہ نمائش مقصود ہے جس میں زائرین و شائقین اور مسافروں کو جلد پہونچانے کے لئے تانگے والے اور لاری والے مارے گھوڑ دوڑ

اور تیز رفتار مقابلے کے شرکت ہرگز نامحال کر دیتے ہیں، اور بعض طرّہ دموری قسم کے تانگے والے اس گھوڑ دوڑ میں ایک ہاتھ سے گھوڑے کو رسی گھما گھما کر مارتے بھی جاتے ہیں اور چلّا چلّا کر یوں گاتے بھی جاتے ہیں ؂
میرے مولا بلالے مدینے مجھے، بلکہ اس نمائش سے مقصد ہے اس نمائش کے چند نمونے پیش کرنا جو انسان کی دانستہ حرکات سے پیدا ہوتی ہے اور جسے "بناوٹ دکھاوا" اور صنعت بھی کہتے ہیں۔

لہٰذا واضح ہو کہ نمائش کا دوسرا نام "نام و نمود" اور مولویوں کی ٹولی میں اسکا نام "ریاکاری" بھی ہے، جس کے اختیار کر لینے سے مسلمان قیامت کے دِن قبر سے اندھا بھی اُٹھیگا، اور "پُل صراط" پر سے گر کر دوزخ میں جلکر خاک ہو جائیگا، اب یہ معلوم کیجئے کہ گو انسان میں یہ جذبہ قدرتی اور طبعی ہے مگر اسکا اظہار اکثر مواقع پر اپنے آس پاس کے حالات اور مؤثرات کے تابع ہے مثلاً آپ اپنے بنگلے سے نہایت "فدوی" نہایت کمترین، نہایت خاکسار، نہایت ہیچمدان، نہایت دعاگو، نہایت فرماں بردار، نہایت تابعدار، نہایت نمکخوار، نہایت خادم، نہایت احقر، نہایت نیازمند، نہایت نیازکیش، نہایت نیاز آگیں اور نہایت "بندۂ بے دام" ہو کر نکلے اور جہاں آپ سے کسی نے کہا کہ کہئے پروفیسر صاحب کہاں؟

کہ بس آپ نے ٹوپی اُتار کر سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا، اور جھک کر دیکھا

کہ جوتے پر زیادہ گرد تو نہیں چڑھ گئی تو سمجھ لیجئے کہ یہ پروفیسرانہ نمائش شروع ہوگئی، اب آپ کالج اور یونیورسٹی سے جتنا قریب ہوتے جائیںگے، آپ کی یہ سمجھ موٹی ہوتی جائیگی ،، کہ میں پروفیسر ہوں، نتیجہ یہ نکلیگا کہ آپ اب دن بھر کرسی پر بیٹھکر پڑھانے کے عوض گھوم گھام کر پڑھاتے رہیں گے، اور چہرہ کو جتنا ہو سکیگا کھسیانہ بنانیکی کوشش کریں گے، اور اگر مونچھیں بچ گئی ہیں تو اُنہیں بل دیجئے گا اور ترچھی نظر سے طلبہ کو دیکھتے جائیے گا کہ وہ دیکھ بھی رہے ہیں یا نہیں، یا پھر آپ مُلّا رموزی کے ساتھ چلا چلا کر مذاق فرماتے ہوئے جا رہے ہیں اور ہاتھ میں ہاتھ دئیے جھومتے ہوئے جا رہے ہیں کہ جہاں سامنے سے طلبہ آتے ہوئے نظر آئے کہ آپ نے مُلّا رموزی سے کہا کہ

ذرا ابھی خموش رہنا کالج کے لونڈے آرہے ہیں، پھر جب یہ طلبہ برابر سے گزرے اور سلام کیا تو آپ نے نہایت موٹا چہرہ بنا کر ہاتھ کے اشارے سے جواب دے دیا، تو یہ بھی نمائش سرا ہے گا ہے کہی جائیگی اور اُصول تعلیم میں یہ تمام نمائشیں حرام ہیں۔ کیونکہ عقلمند لڑکے ان حرکتوں سے بجائے رعب قبول کرنے کے تاؤ کھاتے ہیں یا پھر مذاق اُڑاتے ہیں

اگر آپ ہاکی کھیل رہے ہیں اور تماشائیوں کا مجمع بھی خاصا ہے اس لئے اب اگر سر کے بالوں کو اس طرح حرکت دینگے کہ وہ آپ کی آنکھوں پر آجائیں اور پھر آپ اُنہیں نہایت نفاست سے سر ہلا کر

یا گھڑی بندھے ہوئے ہاتھ سے پھر سیدھا کریں یا پسینہ صاف کرنے کے عذر سے ایک رنگین ریشمی رومال نصف پاجامے کی جیب میں اس طرح رکھیں کہ اسکا ایک حِصّہ تماشائیوں کو نظر آتا رہے یا اپنے ریشمی بنائین کو آپ بار بار کھینچ کر اپنے نصف پاجامے کے اوپر لائیں یا بالوں کے بکھر جانے کے حیلے سے آپ اپنی سفید پیشانی پر ایک شوخ رنگ کا ریشمی رومال باندھ لیں، یا بغیر سُورج کے سامنے آئے آپ ہاکی میں انگریزی سائبان والی ٹوپی اوڑھ کر ہاکی کھیلیں تو آپ کی یہ تمام حرکاتؔ ہاکیانی نمائشؔ مانی جائینگی، اور یہ سب اس لئے ناجائز ہیں کہ انہیں دیکھ کر تماشائی آپ کا "لونڈا پن" اور بے حیائی" قرار دیتے ہیں، اور یہ تو نہایت بھونڈی نمائش ہے کہ آپ ہر جلسے میں سب کے بعد تشریف لائیں تاکہ جلسہ کے زیادہ حاضرین آپ کی تعظیم کے لئے بھی کھڑے ہوں اور تالیاں بھی بجائیں اور یہ تو حد سے سوا بھونڈی نمائش ہے کہ آپ غزل پڑھنے وطن سے چل کر مشاعرہ میں آئیں اور عین وقت پر کہیں کہ آج تمام دن میرے سر میں درد رہا اس لئے پڑھنے سے مجبور ہوں یا یہ کہ غزل نہایت محنت اور غور سے کہہ کر لائے ہوں اور مشاعرہ والوں سے کہیں کہ غزل ابھی ناتمام ہے اور اصلاح طلب، یا تمام مشاعرہ والوں کو چھوڑ کر ہم سے کہیں گہ حضرت مُلّاؔ صاحب، ذرا یہ شعر مُلاحظہ ہو، یا کہ کھانس

کھانس کر جمع کو چور نظروں سے دیکھتے جائیں یا درمیان میں بغیر روزہ رکھے پینے کے لئے پانی طلب فرمائیں، یا اپنے شاگردوں کی طرف اس مقصد سے غور کے ساتھ دیکھیں کہ داد کے لئے تم زور سے چلاؤ تو دوسرے بھی داد دیں، اور یہ تو ذلیل ترین نمائش ہے کہ آپ مرد ہو کر اسکول جائیں تو اس نزاکت سے گویا مُنّی جان الہ آباد والی مُلّا رموزی صاحب کی شادی میں گانے اور ناچنے جا رہی ہیں یعنی چست پاجامہ پر ریشم کی قمیص اس طرح پہن کر اوپر کا بٹن کھلا ہوا ہو تاکہ ماسٹر صاحب اور دوسرے لڑکے دیکھیں کہ قمیص کے اندر کتنا قیمتی بنائین ہے کہ جواب نہیں یا یہ سوچیں کہ آپ کا گلا کتنا سفید اور نازک ہے کہ اُفّوہ، یا آپ گرمی کے عذر سے اپنے ماسٹر صاحب کے سامنے ٹوپی اُتار کر بار بار سر کے بال سنبھالتے جائیں اور دوسرے لڑکوں کی طرف دیکھتے جائیں،

اور یہ نمائش کہاں کی قابل تعریف نمائش ہے کہ آپ روزانہ گلابی رنگ کی ساری پہن کر چشمہ لگا کر اور موٹر پر سوار ہو کر ٹھنڈی سڑک کے اُسی حِصّے سے گذریں جدھر مرد زیادہ ہوں البتہ اسے نمائش نہ کہیں گے کہ آپ اسی انداز کے ساتھ چاوڑی بازار دہلی کے کسی برآمدہ پر بیٹھی ہوئی مُلّا رموزی صاحب کے اشعار گنگنا رہی ہوں، ہاں یہ نمائش

ضرور ہے کہ آپ نہایت نفیس کپڑے پہنے کمپنی باغ میں ٹہل رہی ہوں اور بار بار مردوں کی طرف دیکھتی جاتی ہوں، یہ بھی نمائش ہے کہ آپ غلام ہندوستانی ہو کر جب اپنے بنگلے پر آرام کرسی سے سر لگائے "پائنیر اخبار" پڑھ رہے ہوں اور آپ کا کوئی ماتحت آپ کی خوشامد کے لئے حاضر ہو تو آپ اپنے قحط زدہ چہرہ کو زیادہ رعب والا بنائیں پیشانی پر بل ڈالیں اور اس بدنصیب قومی ماتحت سے نہایت خشک گفتگو فرما کر یہ کہیں کہ اچھا معاف فرمائیے اب میں تو ذرا غسل کے لئے اندر جاتا ہوں، پھر آئیے گا مجھے آپ کا خیال ہے یہ بھی نمائش ہے کہ آپ چندے پر گزارہ کرنے والے لیڈر ہو کر مُلّا رموزی کے خط کا جواب خود نہ لکھیں بلکہ کسی دوسرے دوست سے لکھوا کر آخر میں اپنی دستخط کر دیں تاکہ مُلّا رموزی سمجھے کہ اُفوہ کتنے مصروف لیڈر صاحب ہیں کہ خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں، یہ بھی نمائش ہے اور نہایت بھونڈی نمائش ہے کہ شام کے وقت آپ اپنے باغ میں یا صحن میں دس بارہ کرسیوں کے بیچ میں ایک آرام کرسی پر لیٹ کر بڑے نخرے سے حُقّہ پیتے جائیں اور جو ملنے والے آئیں اُنہیں کھڑی کرسی پر جگہ دیں اور پھر بھی خود کو لکھا پڑھا مشرقی آدمی سمجھیں،

نیچری قسم کی نمائش یہ ہے کہ آپ ہندوستانی کارخانے کے بنے

ہوئے ہو کر بھی انگریز بھائیوں کا سوٹ پہن کر ریلوے اسٹیشن پر جائیں
اور ٹکٹ صرف انٹر کلاس ہی کا ہو مگر پلیٹ فارم پر دیسی مسافروں
سے ایک طرف سیٹی بجا بجا کر یوں سگریٹ پیتے ہوئے ٹہلتے رہیں
گویا آپ کی ولدیت لارڈ کرزن ہے، پھر یہ بھی نمائش ہے کہ انٹر
کلاس میں آپ سوٹ پہنے ہوئے لیٹ کر "اخبار ٹائمس" خواہ مخواہ
پڑھتے جائیں مگر پاس بیٹھے ہوئے ہندوستانی مُلّا مولویوں سے
یہ دریافت نہ کریں کہ

السلام علیکم مُلّا صاحب،
کہئے مزاج تو اچھا ہے،
آج کہاں تشریف لیجا رہے ہیں آپ؟
اگر ضرورت ہو تو میں اپنا بستر پیش کروں؟
لیجئے یہ ناشتہ حاضر ہے،
اچھا تو یہ سگریٹ تو ملاحظہ فرمائیے،
جناب کا وطن،
تو پھر علی گڑھ سے کب واپس ہونگے آپ؟

یہ بھی نمائش ہے کہ آپ اپنے وطن میں تو ہوں فقط رام پرشاد
اور ریل میں بیٹھے ہوئے مسافر کے دریافت کرنے پر آپ کہیں کہ میں دہلی جا رہا ہوں

لکھنؤ میں میرے چچا جان بہت بڑے رئیس اور تعلقہ دار ہیں، دہلی
میں بھی ہماری کوٹھیاں ہیں،

جی ہاں، مُلّا رموزی صاحب میرے خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں،
میں سنہ ۱۹۲۳ء میں لندن میں تھا تو یہ ہوا تھا اور سنہ ۱۹۲۷ء میں جب میں امریکہ
گیا تو وہ ہوا،

جی الحمد للہ، میں مُلازم تو کسی کا نہیں، کچھ تجارتی کاروبار کا
سلسلہ ہے اور یورپ میں بھی میری ایجنسیاں ہیں، والد صاحب قبلہ
آج کل بھی ولایت گئے ہوئے ہیں، مجھے ذرا طاعون کی شکایت
ہو گئی ہے، اس لئے بغرض علاج دہلی جا رہا ہوں،

بس سیسل ہوٹل میں ٹھہروں گا کیونکہ میری کوٹھی نئی دہلی سے
بھی ذرا آگے ہے، بس آپ سیسل ہوٹل کمرہ ۶ع میں آر، پی، ڈبلیو،
کہہ کر دریافت فرمایئے گا، میں مل جاؤنگا، یہ بھی نیچری نمائش ہے
کہ آپ ہندوستانی ہو کر بھی اپنے بڑے مولوی صاحب قسم کے لوگوں
سے مصافحہ کرتے وقت اُن کے ہاتھ کو اس زور سے جھٹکا دیں، کہ
مولوی صاحب دور تک آپ کو بڑبڑاتے ہوئے دیکھتے رہیں، اور
آخر میں آپ یہ بھی کہتے جائیں کہ

تھینک یو ویری مچ،،

یہ بھی نمائش ہے کہ آپ مُلّا رموزی کے متعدد خطوط کے جواب میں ایک نفیس سے لفافہ کے اندر نہایت باریک قلم سے ڈیڑھ سطر میں لکھ دیں کہ جی ہاں یہ ہوا اور وہ ہوا اور مُلّا صاحب معاف کیجیے گا میں آج کل بیحد مصروف ہوں،

یہ اتنی نمائشیں حاضر ہیں جن میں سے بعض اس درجہ نازک اور مہین ہیں کہ انہیں خواص انسانی کے ماہر نفسیات سے واقف حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن اب ان سے بھی سوا نازک اور نا قابل فہم نمائش ملاحظہ ہو جو ایک ہی وقت میں ہزاروں نمائشوں کا مجموعہ بن جاتی ہے، اور یہ نمائش ہے ہندوستان کی عورت ذات، مگر اس سے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ وہ کتاب عورت ذات ہے، جو مُلّا رموزی صاحب نے بہ قیمت تین روپیہ فی جلد حال ہی میں لکھی ہے اور مُلّا رموزی صاحب بھوپال کے پتے سے مل سکتی ہے، تو یہ ہندوستان کی عورت ذات گویا فطری طور پر علی گڑھ کی نمائش سے اونچی نمائش ہے مگر اس کی نمائشوں کا فوراً سمجھ لینا یا اس کے ذی ہوش شوہر کا کام ہے یا پھر مُلّا رموزی صاحب کا کام مثلاً اس سے زیادہ عورت کی مہین نمائش کیا ہوگی کہ یہ خود کو جتنا بیگانہ نمائش بنائے سمجھ لیجیے کہ اتنی ہی زنانے کی

نمائش میں مصروف ہے، پھر جب یہ عورت کے بعد بیوی ہوجائے
تو اُس کی نمائش کے موقع نہایت خاص ہوتے ہیں، پہلا موقع
یہ کہ اس کے ہاں آپ کی بیوی صاحبہ مہمان ہوجائیں دوسرا موقع
وہ کہ یہ مُلّا رموزی صاحب کی تقریب شادی میں جائے، بس جہاں
اس کے گھر میں کوئی عورت مہمان ہو کر آئی اور اب اس کی رگ
رگ سے نمائش کا اظہار شروع ہوا، چنانچہ اب وہ جو حرکت کریگی
نمائش لئے ہوئے، پھر اگر یہ ذرا صاحب اولاد اور ذرا دولتمند بھی
ہے تب تو اُس کی نمائشوں کا عالم ہی نرالا ہوگا' جہاں آپ اس کے
ہاں گئیں اور اُس نے اپنے گھر خاصکر اپنے یا اپنے شوہر کے کمرہ
کی آرائش عین اسوقت شروع کی جب آپ اس سے مخاطب ہو کر
بات کرنا چاہتی ہیں (مرد ناظرین اس وقت معاف فرماویں) بس
یہ آپ سے بات کرتے کرتے یکایک بیچ میں سے یہ کہہ کر اُٹھ جائیگی کہ
بہن ذرا ٹھہرنا میں ابھی آتی ہوں ذرا اُن کے لئے پانی گرم کردوں کیونکہ
وہ دفتر سے آتے ہی گرم پانی سے غسل کرتے ہیں،

بہن ذرا ٹھہرنا میں آتی ہوں ذرا اُن کے لئے چائے تیار کردوں
کیونکہ وہ دفتر سے آتے ہی چائے مانگتے ہیں،

بہن ذرا ٹھہرنا میں اُن کے لئے ٹینس کے کپڑے نکال رکھوں کیونکہ وہ

ٹھیک چار بجے ٹینس کھیلنے جاتے ہیں،

بہن ذرا ٹھہرنا میں آتی ہوں ذرا دیکھ لوں کہ نوکر نے اُن کے جوتوں پر پالش کیا کہ نہیں کیونکہ وہ صبح مجھ سے کہہ کر گئے تھے کہ میں دفتر سے آؤں تو میرے کالے پمپ پر پالش ہو جائے،

بہن ذرا ٹھہرنا میں آتی ہوں اُن کے شکار کے کپڑے نکال دوں کیونکہ آج شام کو وہ شکار کو جا رہے ہیں،

شوہر سے متعلق اتنی نمائشوں کے بعد وہ اب اولاد کو شوہر کے ساتھ ملا کر یوں نمائش کرتی کہ بہن کیا کہوں میں تم سے کہ وہ اس تمھاری جمیلہ سے کتنی محبت کرتے ہیں؟ بس جہاں اِس کے رونے کی آواز سُنی اُنہوں نے اور وہ میرے اوپر غُصّہ ہوئے، اور اُن کا ہر وقت یہی کہنا ہے کہ دیکھو جی تم یوں تو جو تمھارا جی چاہے وہ کرو مگر کبھی میری جمیلہ بیٹی کو کوئی تکلیف نہ ہو، اور یہ تو دیکھئے اُنہوں نے اس شریر کے لئے کتنے کھلونے جمع کئے ہیں، اوفوہ یہ گاڑی وہ دلّی سے لائے تھے اس کے لئے، اور یہ دیکھنا بہن یہ کتنی خوبصورت گڑیا اس کے لئے لائے ہیں وہ مگر یہ ہے اس کو ہاتھ تک نہیں لگاتی، بس یہ گاڑی لئے پھرتی ہے دن بھر اِدھر سے اُدھر،

یہی حال اس کی دادی اماں کا ہے کہ وہ کسی وقت بھی اِسے اپنی

گود سے علیٰحدہ نہین کرتی ہیں بس بہن گھر بھر کا کھلونا ہیں یہ آپ کی جمیلہ بیگم"
ہاں بہن میری بھی یہی دُعا ہے کہ بس خدا انہیں نیک کرے کیونکہ اپنے باپ کی بڑی ہی لاڈلی بیٹی ہیں یہ اولاد کی اس نمائش کے بعد پھر یہ اپنی نمائش میں شوہر کو یوں ملا لیتی ہیں کہ،
اور یہ دیکھئے یہ میرے لئے بھی وہ دہلی کا جوتا لائے تھے حالانکہ میرے پاس ایک چھوڑ تین جوتے نئے موجود ہیں جنہیں میں نے ایک وقت بھی نہیں پہنا ہے مگر اُن کا یہ کہنا ہے بہن کہ چاہے تم کسی چیز کو استعمال کرو یا نہ کرو مگر مجھے جو چیز بازار میں پسند آ گئی اُسے میں تمھارے لئے ضرور لاؤں گا اور میں کہتی ہوں کہ جب مجھے ایک چیز کا شروع ہی سے شوق نہیں تو پھر کیوں آپ پیسہ برباد کرتے ہیں مگر اُنہیں مجھ سے اب کیا کہوں بہن تم سے کس قدر محبت ہے بس اُن کا تو یہ کہنا ہے کہ تمھارے پاس ہر چیز موجود رہے اور کسی وقت تمھیں کسی چیز کی تکلیف نہ ہو یہی حال اُن کا کھانے کے معاملہ میں ہے توبہ کیا مجال بہن جو بغیر میرے وہ لقمہ تو اٹھا لیں، جب تک میں اُن کے ساتھ دستر خوان پر نہ بیٹھونگی وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے اور بیوی خدا بچائے ایک یہ ہمارے پڑوس میں مُلّا رموزی صاحب اور اُن کی بیوی بھی ہیں کہ میں کیا کہوں بہن تم سے اُن کا حال، بس اللہ پاک کی قسم کہ ایک ایسے ایک دوسرے کی

صورت سے بیزار ہے اے بہن کہنے کی بات نہیں بس قصہ اصل یہ ہے
کہ مُلّا صاحب ہیں اُس بیچاری سے ناراض ،

کیوں کیسے ؟

بس ناراض اس پر ہیں کہ وہ غریب بے لکھی پڑھی ہے اور صورت کی بھی ذرا بھدی ہے تو اب بیوی خدا کے بنائے ہوئے سبھی ہیں ایسا بھی نخرہ نہ کرنا چاہئے مردوں کو، کیونکہ صورت میں دیکھو تو ایسی میں کہاں کی پری ہوں مگر خدا کا شکر ہے تمھارے بھائی تو اب میں کیا کہوں تم کچھ دن رہ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ مجھ پر کس طرح فدا ہیں اور کہنے کو مُلّا صاحب مُلّا صاحب مشہور ہیں مگر بیوی تو یہ ایسے بھی کیا مُلّا صاحب کہ اللہ کی اس بیگناہ بندی کی زندگی برباد کر رہے ہیں اور ہاتھئے گا نہیں کسی سے میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اُن دونوں میں بات چیت بھی بند ہے، بس نام کو مُلّا صاحب گھر میں آتے ہیں وہ اُن کی ملازمہ ہی اُنہیں کھانا دے دیتی ہے بس کھانا کھایا اور جو مُلّا صاحب گھر سے نکلے تو پھر ٹھیک دو بجے رات کو آتے ہیں اور یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ مُلّا رموزی صاحب نے حسین بیوی کی تلاش میں سنا ہے کہ اشتہاروں میں بھی چھاپ دیا تھا مگر کوئی حسین بیٹی دیتا تو میاں کو کس بات پر، تنخواہ دیکھو تو میاں کی کچھ بھی نہیں اور اوپر سے

خرچ اخراجات وہ کہ الاماں وہ دیکھونا بہن کہ خالو میاں نے اپنی بچی کو جو آج تک بٹھا رکھا ہے تو اُن کا بھی یہی خیال ہے کہ دوں گا تو کسی ایسے ہی کو جو کھاتا پیتا ہو اور گھر سے خوشحال ہو، اگرچہ لڑکی کی عمر اب کوئی پچیس سال کے لگ بھگ ہے مگر خالو میاں کی یہی ضد ہے کہ جیسا میں چاہتا ہوں ویسا لڑکا جب تک نہ ملیگا میں کبھی لڑکی کو نہ دوں گا"، حالانکہ وہ گھر ہی میں چچا کا لڑکا بی، اے پاس بیٹھا ہے مگر کیا کہ بس تنخواہ کمبخت کی پچاس ہے،

ارے بہن تو اب یہ کون کہے خالو میاں سے کہ لڑکی کی عمر تباہ ہو رہی ہے کیونکہ اب تو ہر خاندان میں لڑکیوں کا یہی حال ہے کہ بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں مگر نہیں دی جاتی ہیں، بس بہن خدا شرم رکھے ہمارے تو والد نے اُن کے ہاں کا پہلا پرچہ دیکھ کر ہماری والدہ سے کہہ دیا تھا کہ بس بسم اللہ کرو اب لڑکی کا نصیب،

اِس قسم کی "بالمشافہہ نمائش"، کے بعد عورت ذات کی دوسری نمائش کا موقعہ فلاں موزی صاحب کی شادی کی تقریب ہے بس جہاں یہ شادی کے گھر میں داخل ہوئی کہ اب وہ اولاد سے لیکر اپنی ایک ایک چیز کی نمائش کی فکر میں مبتلا ہو جائیگی وہ جس طرف عورتوں کا مجمع زیادہ پائے گی، اُدھر جائے گی، پھر اپنے لباس اور زیور کو پہلے

خود دیکھے گی، اور پھر قسم قسم کی ترکیبوں سے محفل کی عورتوں کو اپنی چیزوں کے دکھانے کے لئے متوجہ کریگی، چلے گی تو باجے والے زیور کو زور سے بجا کر اور بیٹھے گی تو اسی ترکیب سے اور جو اس پر بھی کسی نے توجہ نہ کی تو خواہ مخواہ بے حیا بنکر نئی عورتوں سے گفتگو شروع کریگی اور تھوڑی دیر بعد انہیں باتوں باتوں میں اپنا زیور اُس کی جھوٹی قیمت اور اُس کے قسم اوّل ہونے کی تعریف خود ہی شروع کردیگی، اور یہ بھی نہیں تو عورتوں کے سامنے بیٹھ کر کسی زیور کو خود ہی الجھائے گی اور خود سلجھانے بیٹھ جائیگی اور اسی بہانے سے کسی عورت کو بُلا کر کہے گی کہ بہن ذرا میری یہ بالیاں سلجھا دینا میں تو تنگ آگئی ان بالیوں سے کہتی تھی کہ دیکھو اتنی قیمتی بالیاں نہ لانا میں انہیں نہ پہنونگی مگر وہ کہاں مانتے ہیں میرا کہنا حالانکہ اس سے پہلے بھی تین ایسی ہی بالیاں توڑ چکی ہوں، خراب گھر تو جاؤں ان کمبختوں کو بھی نہ آگ لگا دوں تو میرا نام غرض مطلب ان تمام باتوں سے یہ ہوتا ہے کہ یہ بالیاں سلجھانے والی اجنبی عورت ان بیوی کے زیور کی قیمت اور ان کے شوہر کی نازبرداری اور محبت کی قائل ہو جائے ،،

یہ ہیں چند نمونے انسانی نمائش کے" اب آپ فیصلہ فرمایئے کہ ان میں سے کتنی نمائشیں ترک کرنے کے قابل ہیں تاکہ دنیا میں عقلمند لوگ آپ کا مذاق نہ اُڑا سکیں ہ فقط

خوشامد

یہ ایک ملکہ ہوتا ہے جو انسانی قویٰ کے اضمحلال اور شدید ترین ضرورت سے پیدا ہوتا ہے، جیسی کسی انسان کی قوت اوراک "ہمت" اور خودداری جب مضمحل یا مردہ ہو جاتی ہے تو وہ خوشامد اختیار کرتا ہے، اربابِ علم و اصحاب مجد و شرف نے اس ملکہ کو ملعون کہا ہے اور یہ ایک شرمناک اور ارذل فعل ہے اور اس کا اختیار کرنے والا بھی ذلیل ہے اس قوت کا پہلا اثر انسان کے اندر بے غیرتی، بے شرمی، مکروفریب، جھوٹ اور حرص پیدا کرنا ہے، اس کی عملی صورتیں یہ ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کی اعتدال سے زیادہ تعریف کرے، اس کی کمزوریوں پر جان بوجھ کر کبھی کچھ نہ کہے بلکہ اُن کمزوریوں کی بھی تعریف کرے اُس کی حیثیت کو ہمیشہ اصلیت سے زیادہ خوبصورت رنگ میں دکھائے اور خود کو اُس کے مقابل ہمیشہ کمترین مسکین،

حقیر، فقیر، نیاز مند، دعاگو، بے نوا، ناتوان اور فدوی ثابت کرے اور اگر ہو تو خود کو چھوٹے چھوٹے سینگ والا گدھا بھی باور کرا دے۔ اس طریقے کو اختیار کرنے والے وزراء بھی ہوتے ہیں اور علماء بھی، ایڈیٹر بھی، لیڈر بھی، حکماء، فلاسفہ بھی، خدام اور چپراسی بھی، محلِ وقوع یا محلِ عمل صرف موقع اور ضرورت کا تابع ہے یعنی جہاں جس کو ضرورت لاحق ہو،

البتہ خوشامد اور تحسین و اعترافِ حقیقت میں بہت نازک سا فرق ہے جو لفظاً تو خوشامد سے مشابہ ہوتا ہے مگر اصولاً نہایت جائز اور ضروری عمل ہے، مثلاً کسی شاعر کے ایسے شعر پر بے حد و بے اندازہ تعریف کرنا جو قابلِ احترام جذبات کا محرک ہو خوشامد نہیں۔ بلکہ تحسین اور اعترافِ کمال ہے اسی طرح کسی بے مثل کام کی کافی تعریف کرنا خوشامد نہیں بلکہ حوصلہ افزائی اور قدر دانی ہے لیکن اس کے لئے بھی ذہنی صلاحیت اور قابلیت درکار ہے چنانچہ ہوتا ہے کہ کسی محفل میں ایک شخص کے اظہارِ کمال پر وہی شخص غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے جو اس محفل میں سب سے زیادہ صاحب درک و بصیرت ہوتا ہے اور وہی اس کمال کی تعریف سب سے سوا کرتا ہے یہاں تک کہ بے خرد اور بے حس ارکانِ محفل اس کی حد سے بڑھی ہوئی تعریف کو مبالغہ یا خوشامد کہتے ہیں حالانکہ ایسی تعریف خوشامد نہیں ہوتی بلکہ اعترافِ کمال بقدرِ صلاحیت ہے جو ہر شخص کو حاصل نہیں،

ہندوستان میں جہالت، بے ہنری اور غلامی کی وجہ سے مزاجوں میں خوشامد کی قوت غیر معمولی اور زیادہ ہے اس ذلیل جذبے میں ایک اثر عشرت پسند سلاطین ہند کے درباروں کا بھی ہے، جہاں کبھی عرفی، فیضی اور دوسرے شعرائے فارس نے قصائد کے ذریعہ واقعی خوشامد کی بنیادوں کو استوار کیا تھا۔

عہد حاضر میں مغربی اثر و تربیت نے اس جذبہ کو ایک دوسری صورت سے باقی رکھا۔ علاوہ ازیں حکمران طبقہ کی اقتدار پسندی، جبر اور قوت کا مظاہرہ ہے۔ ان اثرات نے ہندوستانی ذہنیتوں میں حکمراں طبقہ کا خوف پیدا کیا اور اس سے خوشامد، جھوٹ، مکر و فریب، وغیرہ کی ارذل قوتوں نے پرورش پائی ورنہ یہ خوشامد نہیں تو کیا ہے اور یہ خوشامد پسندی نہیں تو کیا ہے کہ دفتر کا ایک ایسا ملازم جو دن بھر دفتری کام میں اپنے دماغ کے خونی قطرات ضائع کرتا ہے، مگر ترقی نہیں پاتا اس دفتری ملازم کے مقابل جو افسر کے گھر پر صبح و شام حاضری دیتا ہے اور ذرا اچھا ہو کر افسر کو روزانہ سلام کرتا رہتا ہے،

خوشامد کی چند عملی صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ انسان دن بھر دفتر میں مستعدی سے کام کرے اور شام کو گھر جانے سے پہلے افسر کے بنگلہ پر جاکر بیٹھ جائے یا کھڑا ہو جائے یا ٹہلتا رہے یا کرسی پر بیٹھ کر افسر کے انتظار میں اونگھتا رہے، یا جمائیاں لیتا رہے، یا انگڑائیاں لیتا رہے یا کھانستا رہے

یا گنگناتا رہے، یا ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ایک ٹانگ کو ہلاتا رہے، یا افسر کے بنگلہ کی تصویریں دیکھتا رہے یا اُس کے باغ کے درختوں پر نظر ڈالتا رہے اور اس پر جب افسر کلب سے واپس نہ آئے تو اُس کے خادم سے یہ کہہ کر واپس چلا آئے کہ چراغ دین سلام کو حاضر ہوا تھا۔ انشاءاللہ کل پھر واپس ہوگا، یا پھر افسر کے خانساماں سے باتیں کرتا رہے اُسے پان کھلاتا رہے اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہے یا افسر کے بچوں کو مصنوعی محبت کے ساتھ گود میں لئے پھرے انہیں پیار کرے اور باغ میں ٹہلاتا رہے تاکہ افسر دیکھ کر یقین کر لے کہ اسے میری اولاد سے اپنی اولاد سے زیادہ محبت ہے، یا افسر کے پاس بیٹھ جاوے اور بغیر افسر کی توجہ کے یہ خود بخود اس کے ہر فقرے کی تائید کرے اور کہے کہ بیشک حضور ایسا ہی ہے یا پھر افسر کے سامنے نہایت مؤدب صورت بنا کر بیٹھ جائے کہ خوشامد کی یہ بھی ایک صورت ہے، کیونکہ اس سے افسر کے علی گڑھی غرور میں اضافہ ہوتا ہے۔

ایک خوشامد افیونی کی طرف سے ہوتی ہے جو وہ کسی ایسے چائے فروش کی کرتا ہے جو اُسے کبھی کبھی مفت اور اکثر قرض پلاتا رہتا ہو۔ افیونی صبح سے ہوٹل پر پہنچ جاتا ہے اور ہوٹل کے مالک کو دیکھتے ہی عرض کرتا ہے

میاں آج تو آپ بہت دیر میں اُٹھے سو کر۔

ہاں صاحب تو وہ دن رات تو آپ یہاں سے جنبش نہیں کرتے،

بڑا مشکل کام ہے صاحب دکانداری بھی،

وہ تو آپ ہی کی ہمت ہے جو گیارہ سال سے آپ اس ہوٹل کو یوں چلا رہے ہیں کہ دوسری دکان اس کے سامنے جمنے ہی نہیں پاتی اور میاں ہے بھی یہ کہ جو چائے آپ کے یہاں ملتی ہے میں نے تو ایک ہوٹل میں نہ پائی ویسی،

ہاں ہاں تو یہ کون کہتا ہے کہ اللہ میاں کا فضل نہیں ہے مگر وہ تو ترکیب بھی تو چاہئے ہر کام کے اندر۔

اچھا تو ننھے میاں سکول گئے ہیں۔

بہت اچھا کیا صاحب آپ نے اُنہیں پڑھانے بٹھا دیا یہ دیکھئے نا کہ آخر ہم رہ گئے نا جاہل، اور جو آج کو کچھ کر لیتے حاصل تو ان جاہلوں کے ساتھ کیوں مارے پھرتے اِدھر اُدھر؛

اے صاحب کیا کہیں وہ تو قسمت ہی میں نہ تھا ورنہ آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے والد صاحب نے اللہ اُنہیں جنت دے ہماری پڑھائی کے لئے کیا کچھ نہ کیا؛

چنانچہ ایک دفعہ کا قصہ ہے ....

....

طویل قصہ کے بعد۔

ماشاء اللہ یہ نقشے تو آپ نے بڑے ہی موزوں لگائے ہیں۔

کیا فرمایا؟

یہ نہج والا نقشہ؟

اچھا مکہ شریف کا ہے،

سبحان اللہ کیا جگہ ہے۔

خدا ہر مسلمان کو اس کی زیارت نصیب کرے،

مگر صاحب بنانے والے کی بھی تعریف ہے کہ اُس نے بھی کیا کاری گری دکھائی ہے کہ عین میں وہی نقشہ کھینچ دیا ہے اور صاحب حق یہ ہے کہ آپ نے بھی خوب ہی جڑوایا ہے۔

بھلا کیا دام دئے ہوں گے اس کے،

ماشاء اللہ تو پھر وہ کہا ہے ناکہ جتنا گُڑھ ڈالئے اُتنا ہی میٹھا ہوتا ہے اور صاحب یہ جگہ ہی ایسی ہے کہ اگر اس پر جان تک نثار کر دی جائے تو کم ہے،

اور پھر آپ کا اسے ایسی جگہ لٹکانا کہ جو آتا ہے پہلے اسی پر نظر پڑتی ہے اُس کی صلِّ علیٰ،

اگر چائے دم ہو چکی ہو تو ایک پیالی عنایت فرما دیجیے کیونکہ اب مجھے ذرا جانا ہے بھائی سعد اللہ خاں کے پاس، جی ہاں ڈھائی

آنے ہیں کل کے میرے ذمّہ،

دونگا انشاءاللہ جلدی،

واہ کیا بنی ہے کہ سبحان اللہ،

بس یہی تو بات ہے آپ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چائے میں،

ایک خوشامد اخباری ہوتی ہے مگر یہ اس قدر بھونڈی خوشامد ہوتی ہے جو آسانی سے پہچان لی جاتی ہے البتہ کبھی کبھی یہ خوشامد بہت بلیغ اور پیچیدہ ہوتی ہے مگر ارباب علم وفضل اسے بھی بڑی آسانی سے پہچان لیتے ہیں اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی شخص کے محاسن، اور اُس کی خدمات کو واقعہ کے طور پر لکھ کر یوں چھوڑ دیا کہ خود اپنی طرف سے کچھ اضافہ نہ کیا تاکہ عوام سمجھیں کہ محض اظہار واقعہ ہے خوشامد نہیں حالانکہ یہ خوشامد ہی ہوتی ہے مثلاً کبھی کبھی ریاست حیدر آباد کی تعریف یوں کی گویا ہندو لوگ اس اسلامی حکومت کے خلاف جو کچھ لکھ رہے ہیں یہ اصل میں اُس کی تردید ہے حالانکہ خوشامد اُسی وقت مکمل ہو گئی جب حیدر آباد کی تعریف محض کی اور اُس کی کمزوریوں پر کبھی ایک حرف بھی نہ لکھا، ہز اکسلنسی وئیسرائے کو، حضور وئیسرائے بہادر لکھنا خوف ہے خوشامد نہیں حضرت ابوالکلام آزاد کو "امام الہند" لکھنا خوشامد ملا ہوا واقعہ ہے، دیسی والیان ریاست کی کسی قسم کی تعریف بھی خوشامد ہی خوشامد ہے واقعہ نہیں، مالک

اخبار کے لئے ایڈیٹر کا یہ لکھنا کہ جب آپ نے ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی تو جلسہ میں سناٹا چھا گیا ملازمانی خوشامد ہے رئیسوں کی غزل پر یہ عنوان لکھنا کہ کلام الملوک ملک الکلام خوشامد ہے اور بہت بھونڈی خوشامد ہے اگر کوئی شخص کسی اخبار کے دفتر میں ایڈیٹر کے پاس بڑے تپاک سے جا کر بیٹھ جائے اور کہے کہ پرسوں کے دن آپ کا جو مضمون شائع ہوا اس کا تو جواب ہی نہیں تو سمجھو کہ تازہ پرچہ مفت پڑھنے کے لئے خوشامد کر رہا ہے اگر ملا رموزی صاحب اپنے مضمون میں کسی شخص کی تعریف کریں تو سمجھو کہ خوشامد ہے مضمون نگاری نہیں اِلّا ماشاءاللہ۔ اگر کوئی اہل قلم اپنی کسی کتاب کا انتساب کسی بڑے آدمی کے نام کے ساتھ کرے تو جان لو کہ تصنیفی خوشامد ہے انتساب نہیں اگر اکبر آباد کا ایک شاعر یا دونوں شاعر کسی کے لئے قصیدہ لکھیں تو مان لو کہ شاعری نہیں خوشامد ہے اگر کوئی شخص کسی خان بہادر کو "ٹی-پارٹی" دے تو کہیں گے کہ خوشامد ہو رہی ہے چار نوشی نہیں، اگر کوئی ملازم اپنے افسر کو اسٹیشن پر رخصت کرنے جائے یا اُس کی آمد پر اُسے ہار پہنائے تو مان لیجئے کہ خوشامد کر رہا ہے اظہار خلوص نہیں اگر کوئی ماتحت اپنے افسر کو ڈالی بھیجے تو سمجھو کہ خوشامد بھی ہے اور رشوت بھی اگر کوئی وکیل اپنے موکل کو اپنے برابر کی کرسی پر جگہ دیدے، اپنے لکھنؤ کے خمیرے والا حقہ بھی پلائے، پان کھلائے اور

یہ کہے کہ آ جائیگا مخنثانہ ایسی کونسی جلدی ہے تو سمجھو کہ خوشامد ہے وکالت نہیں۔ اگر کوئی وکیل عدالت کے حاکم کے گھر جا کر اُس سے کہے، کہ پرسوں حضور نے جو فیصلہ لکھا ہے حقیقت میں وہ حضور کی قانونی واقفیت کا لاجواب ثبوت ہے تو سمجھو کہ خوشامد ہے وکالت نہیں، کسی کے ولیمہ کا پلاؤ چاہے پسند ہو یا نہو مگر دولہا کے باپ سے یہ کہنا کہ ماشاء اللہ کیا کھانا پکایا ہے خوشامد ہے داد نہیں۔ کسی دولہا کا اپنے خسر کے گھر جانا، اپنی ساس کا علاج کرانا، اور اپنے سالوں کی تعلیمی نگرانی کرنا بیویانہ خوشامد ہے۔ خلوص و محبت اور حقوق شناسی نہیں کسی دکاندار کا اپنے گاہک کے لئے فوراً کرسی پیش کرنا، پان کھلانا، شربت پلانا، بجلی کا پنکھا چلانا اور ہنس ہنس کر مال دکھانا خوشامد ہے تجارت نہیں کسی گداگر کا روٹی پا کر صاحب خانہ کے حق میں دعائے خیر کرنا خوشامد ہے شکریہ نہیں، مالدار ماں باپ کے سامنے ادب سے خموش بیٹھ جانا خوشامد ہے، سعادت مندی اور فرماں برداری نہیں،

ایک خوشامد صوفیانہ ہوتی ہے جو پیر صاحب کی طرف سے کیجاتی ہے اور یہ ایسے پیر صاحب ہوتے ہیں جو رنگین لباس کے سوا علم دین اور علم تصوف سے کچھ بھی خبردار نہیں ہوتے محض مریدوں پر رعب قائم رکھنے کے لئے خوشامد کرتے ہیں مگر بڑی نازک خوشامد کرتے ہیں، مثلاً

پیر صاحب کا مالدار اور افسر قسم کے مریدوں کے گھر خود بخود جانا خوشامد ہے، پیری نہیں، عین قوالی کی حالت میں کسی مالدار مرید کو اپنے برابر بٹھانا خوشامد ہے نوازش نہیں۔ مالدار مریدوں کے بچوں کے لئے بڑی مستعدی سے تعویذ لکھنا اور یہ کہنا کہ مجھے تمھارے بچوں سے بڑی محبت ہے خوشامد ہے محبت نہیں عرس کے موقع پر غریب مریدوں سے سیدھی طرح بات نہ کرنا اور مالدار مریدوں کو اذن کے لفافے بھیجنا خوشامد ہے دعوت نہیں، قوّال کا پیر صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دینا خوشامد ہے عقیدت نہیں،

سب سے آخری یا ضروری خوشامد شوہر اور بیوی کی خوشامد ہے جس میں مُلّا رموزی صاحب سے لیکر شاہ امان اللہ خاں تک مُبتلا ہیں یہ خوشامد نہایت بلیغ اور غیر محسوس بھی ہوتی ہے اور بھونڈی بھی پھر یہ کہ کہیں شوہر زیادہ خوشامد کرتا ہے اور کہیں بیوی اور اس لئے اس خوشامد میں کوئی اُصولی تسلسل نہیں ہوتا البتہ یہ ضرور ہے کہ شوہر کی طرف سے خوشامد زیادہ کیجاتی ہے اور بیوی کی طرف سے کم، کیونکہ بیوی کی طرف سے نان کوآپریشن، بائیکاٹ، ترک موالات، عدم تعاون، مقاومت مجہول، نان وائیلنس، واک آوٹ، قطع تعلق کے جس قدر مظاہرے کیئے جاتے ہیں شوہر کی طرف سے ناممکن ہیں اور دشوار بھی

اور یہ محض مہر کی رقم ادا کرنے کے ڈر سے، اس لئے اگر شوہر ولیمہ کے دن ہی اپنے روپیہ سے بیوی کے لئے نیا زیور خرید لائے تو سمجھو کہ خوشامد شروع ہو چکی یا شروع ہو رہی ہے یا شروع ہو گئی یا شروع ہوئی تو ہوئی ہوئی یا ہوئی تو پھر ہوتی ہی رہیگی اور جب ہوتی ہی رہیگی تو ہوتی ہی چلی جائیگی یا پھر شوہر صاحب بغیر طلب کے اگر بازار سے بیوی کے لئے پمپ جوتا، لونڈر، موزے اور صابون خرید لائیں تو سمجھو کہ خوشامد ہے اور محبت بھی اور جب شوہر صاحب ہنس ہنس کر باتیں کریں اور ہنسی کا موقع نہ ہو تو سمجھو کہ خوشامد ہے یا شوہر صاحب کہیں کہ اچھا تو لاؤ ننھے میاں کو مجھے دیدو اور تم تھوڑی دیر آرام کرلو تو سمجھو کہ وہی ہو رہی ہے یا شوہر صاحب کہیں کہ مجھے سوائے تمھارے ہاتھ کے کسی دوسرے کی پکائی ہوئی ترکاری میں مزہ ہی نہیں آتا تو سمجھو کہ ہو رہی ہے، یا شوہر صاحب کہیں کہ میں خود پان لگالوں گا تم نہ اُٹھو تو سمجھ لو کہ ہو رہی ہے یا شوہر صاحب کہیں کہ تم مجھ سے ذرا ذرا سی بات پر نہ بگڑا کرو میں تو تم سے مذاق کرتا ہوں تو سمجھو کہ ہو رہی ہے، یا شوہر صاحب کہیں کہ تم اپنی والدہ کے ہاں جاتی تو ہو مگر جب تک واپس نہیں آتی ہو تو یہ گھر مجھے ویرانہ نظر آتا ہے تو سمجھو کہ ہو رہی ہے اور بہت بھونڈی ہو رہی ہے یا شوہر صاحب کہیں کہ اچھا ہے دو چار دن کے لئے امّاں بی کے ہاں چلی جاؤ وہ تمھیں

یاد کرتی ہیں تو سمجھو کہ ہو رہی ہے مگر مجبوراً ہو رہی ہے یا شوہر صاحب کہیں
کہ خدا کے لئے تم میرے سامنے تو کسی کام میں مصروف نہ ہوا کرو آخر
یہ ملازمہ کس دن کے لئے رکھی ہے تو سمجھو کہ ہو رہی ہے یا شوہر صاحب
کہیں کہ جب تک تم میرے ساتھ کھانا نہیں کھاتی ہو تو مجھے کھانے کا
مزہ ہی نہیں آتا تو سمجھو کہ ہو رہی ہے یا شوہر صاحب کہیں کہ اُفوہ آج
میرے سر میں کس شدت کا درد ہے مگر تم نہ دباؤ تمہارے ہاتھوں میں
درد ہو جائے تو سمجھو کہ ہو رہی ہے، یا شوہر صاحب اپنے خسر، سالے، سالی
اور ساس کی تعریف اپنی بیوی کے سامنے کریں تو مان لو کہ اب تو بالکل
وہی ہو رہی ہے یا شوہر صاحب روزانہ سسرال کی خیریت دریافت
کر کے بیوی کو اطلاع دیتے رہیں تو سمجھو کہ وہی ہو رہی ہے مگر بڑی بیوقوفی
کے ساتھ ہو رہی ہے اور جب شوہر صاحب اس حد تک پہونچ جائیں تو
سمجھو کہ ان کی ہر حرکت بس وہی ہے یعنے خوشامد۔

شوہر کے بعد بیوی کی خوشامد نہایت منطقی اور عالمانہ ہوتی ہے جو
آسان نہیں، مثلاً بیوی کا لباس کے اعتبار سے ہر وقت نیلم پری بنا رہنا،
سمجھو کہ خوشامد کا نہایت فاضلانہ آغاز ہے اور جب بیوی کہے کہ آج تو ننھا،
تمہیں یاد کرتے کرتے سو گیا تو سمجھو کہ ہو رہی ہے اور ننھے کے ذریعہ ہو رہی ہے
اور جب وہ شوہر کے کپڑے جوتا، چشمہ، پان کا ڈبہ اور سگریٹ کیس اپنے

ہاتھوں سے صاف کر کے رکھ دیں تو سمجھو کہ ہو رہی ہے اور اگر بیوی کہے کہ جب تک آپ نہ آئیں گے میں کھانا نہیں کھاؤں گی تو سمجھ لو کہ ہو رہی ہے اور جو بیوی کہے کہ مجھے نہ زیور کی پرواہ ہے نہ کپڑے کی بس خدا آپ کو میرے سر پر سلامت رکھے تو سمجھو کہ بڑے زور کی ہو رہی ہے اور جو بیوی کہے کہ تم سے زیادہ عزیز مجھے دنیا کی کوئی چیز نہیں تو سمجھو کہ ہو رہی ہے، اور اب تو خاتمہ کی ہو رہی ہے،

یہ ہیں وہ چند نمونے خوشامد کے جن سے محفوظ رہنا ہی عین خودداری اور اصل غیرت و حمیت ہے، ہماری رائے میں ان تمام خوشامدوں میں بیوی کی خوشامد نہایت تلخ اور بے فائدہ ہے، ممکن ہے ہماری اس رائے سے تمام دنیا کی ننھے میاں کی والدائیں ناراض ہو جائیں اور خود ہمارے ذاتی ننھے میاں کی تازہ والدہ تو اس پر یقیناً ناراض ہونگی مگر ہم اظہار رائے میں کبھی اُن کی مُروّت کو دخل نہ دیں گے، کیونکہ بیوی کی خوشامد ہی انسان کی تباہی کا باعث ہے دوسری تمام خوشامدوں سے فائدہ ہی فائدہ ہے صرف ذرا انسان دنیا جہاں میں ذلیل ہو جاتا ہے، لیکن آج کل کی تعلیم و تربیت نے اُسے جائز کر دیا ہے اس لئے وہی آج بیوقوف مانے جاتے ہیں جو خوشامد نہیں کرتے اور اسی لئے وہ تمام لوگ آج ملازمانی خوشامد میں مصروف ہیں جو کل تک ترک

موالات کے ذریعہ گورنمنٹ تک سے اپنی خوشامد کرانا چاہتے تھے،
ماسٹروں کی خوشامد یہ ہے کہ وہ ٹیوشن والے لڑکے کے باپ سے
کہیں کہ ماشاء اللہ بچہ بڑا ذہین ہے اور گورنمنٹ کی خوشامد یہ ہے کہ
وہ خطاب بھی دے اور جاگیر بھی اور مُلّا رموزی صاحب سے مُصافحہ
بھی کرے۔ فقط

سقّے کے بچّے

اُمّت اسلامیہ کے لئے انقلاب کابل جو افسردگی، حزن وملال اور درد وکرب کا سامان نظر آتا ہے، بہت کم انقلابات اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں مثلاً جو روایتی ہینگ فروش" افغانی ساری دنیا میں، کل تک صرف اس قابل سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہندوستان کے کسی رام پرشّاد کو سو طرح سے آمادہ کر کے اُسے اپنا کپڑا قرض دے دے اس طرح کہ وہ جب چاہے اس کپڑے کی قیمت ادا کر دے، مگر جیسے ہی مہینے کی پہلی تاریخ ہوئی یہ افغانی صاحب مع ایک عدد بانس کے لٹھ کے اس رام پرشاد کے چبوترے پر یوں بیٹھے نظر آرہے ہیں، کہ جب تک رام پرشاد ان کا ایک ایک پیسہ ادا نہ کردے وہ جانے کا نام نہیں لیتے مگر یہی افغانی تھا کہ غازی امان اللہ ایسے بیدار مغز، اور

ذی حوصلہ بادشاہ اور شاہ نادرشاہ بہادر ایسے ذی ہوش سردار سپہ کے
حوصلہ آزما جہاد حریت کے زیر اثر دولت خداداد افغانستان کی آزادی کا
وہ جھنڈا بن گیا جو کابل سے لیکر روس تک اور ہندوستان سے لے کر
انگلستان تک یوں لہرانے لگا کہ بالآخر اُسے نظر ہوگئی یعنی حضرت گرامی
غازی امان اللہ خاں سابق تاجدار افغانستان کو یورپ کا دورہ کرنا ضروری
سا ہوگیا، بس ان کا یورپ تشریف لے جانا تھا کہ افغانستان کے چند بڑے
ہی عقلمند، بڑے ہی ذی ہوش، بڑے ہی قابل، بڑے ہی اللہ والے، بڑے
ہی نمازی، بڑے ہی پرہیزگار، بڑے ہی قومی ہمدرد، اور بڑے ہی منتظم مسلمان
بھائیوں نے طے فرمایا کہ اب غازی امان اللہ کو تو اس قابل بنا دو،
کہ وہ عمر بھر ملک اٹلی میں حرکت بھی نہ کرسکیں اور خود افغانستان کے بادشاہ
سلامت بن جاؤ کہ اس طرح جہاں تخت افغانستان پر قبضہ آسانی سے
ہو جائیگا وہاں ستّر اسّی ہزار افغانی مسلمانوں کے خاک و خوں میں ملجانے
سے ساری دنیا میں افغانی قوم کی جہالت مُسلّم و مشہور تو ہو جائیگی، اس
خیال کی تکمیل کے لئے اُن افغانی یاروں نے ایک ایسے شخص کو سرداری
کے لئے آگے دھر لیا جو تاریخ افغانستان میں عمر بھر کے لئے، مسمّی
"بچہ سقا" ہو کر رہ گیا، یہ غریب اسوقت افغانستان کے خدا جانے کس غار
میں بیٹھے مسواک فرما رہے تھے کہ یاروں نے انہیں اکسایا اور وہ بڑھ کر

اتنے لمبے ہو گئے کہ کچھ دن کے لیئے " شاہ افغان" بن گئے۔ وہ تو خیر ہوئی۔ یا حضرت خلیفۂ قادیان کی بددعا کہیئے ورنہ اُنہوں نے اپنے آپ کو "خلیفۃ المسلمین" بنانے میں کوئی کسر ہی اُٹھا نہ رکھی تھی اور جب یہ ہو جاتا تو بس پھر آج کو ساری اسلامی دنیا کی جبینِ عقیدت ہوتی اور "حضرت سقۃ المسلمین" کے گنواروں کی طرح قدم ہوتے، بارے اب کہ حضرت "سقے کے بچے" پھانسی پا کر ہمیشہ کے لیئے "راجعون ہو چکے ہیں" جایز نہیں کہ ان کے مصائب پر کچھ زیادہ کہا جائے۔

البتہ یہ صحیح ہے کہ انقلاب کابل کے سلسلے میں بچہ سقہ کے نام اور کام نے ہندوستانی مسلمانوں کے دماغوں ہی کو نہیں بلکہ ان کے ادب کو بھی بہت زیادہ متاثر کیا اور ممدوح غفران مرکان کی زندگی ہی میں لفظ "بچہ سقا" زبان اردو میں عجیب عجیب معنی میں استعمال ہونے لگا تھا اور غلط نہیں کہ اس نام سے اکثر، ذلت رسوائی اور تضحیک کا مفہوم پیدا کیا جاتا تھا۔ پس ظاہر ہے کہ اس مفہوم کے لیئے لفظ بچہ سقا سے مراد وہ آدمی نہ تھا جو افغانی بغاوت کا سرغنہ تھا اور جو مسہری پر سونے سے ڈرتا تھا، اور جس نے کارتوسوں کی پیٹیاں کمر سے باندھکر فوٹو کھچوایا تھا تاکہ ہندوستان کے "لکھنوے" تصویر ہی دیکھکر کانپ جائیں، بلکہ "بچہ سقا" سے مراد ہر وہ شخص ہو سکتا

ہے جو مرحوم "بچہ سقا" کے خواص و اعمال کا آئینہ دار ہو۔ پھر ضروری نہیں کہ ان اعمال و اخلاق کا نمونہ صرف حدود افغانستان ہی میں رہے اور ہندوستان میں نظر نہ آئے۔ پس جس شخص کے اندر بہ استثناء ریش مبارک ذیل کی چیزیں یا علامتیں نظر آئیں سمجھ لیجیے کہ آپ ہی ہیں "بچہ سقا" مثلاً

۱۔ وہ طبعاً حریص ہو۔

۲۔ خدائے عرش و فرش کے احکام کو اس لیے توڑ سکتا ہو کہ کابل کا تخت مل جائے گا۔

۳۔ یا اس لیے کہ روپیہ۔ نوٹ۔ گنی۔ اشرفی، اور اکنی ہاتھ آئیگی۔

۴۔ رولز رائیس موٹر کار پر چڑھے پھریں گے۔

۵۔ رہنے کو بہترین اور شاندار "غریب خانہ" ہاتھ آئے گا۔

۶۔ قدسی فریب عورتوں سے جبراً نکاح کریں گے۔

۷۔ بے شمار یا چند آدمی جھک کر سلام کریں گے۔

۸۔ ٹکٹ، اسٹامپ۔ روپیہ نوٹ، اور دفتر کے کاغذات پر تصویر ہوگی۔ عام اس سے کہ تصویر کتنی ہی قحط زدہ بھی ہو۔

۹۔ قوم کا شیرازہ کل کا بکھرتا آج بکھر جائے مگر ہم ہر حال میں بڑے آدمی ہو کر رہیں گے۔

۱۰۔ بلا سے شاہ نادر شاہ غازی کے ہاتھوں گت بنے گی اگر چند دن

تو بادشاہ سلامت کہلائیں گے اور اخبار "زمیندار" میں نام چھپیگا۔
۱۱۔ اپنے عزیزوں اور ساتھیوں کو جاگیریں دیں گے جس سے وہ جاگیردار
اور زمیندار کہلائیں گے۔ خواہ یہ جاگیریں اُن کے قبضہ میں رہیں یا نہ رہیں۔

یہ وہ اعتبارات اور خصائص ہیں جو کابل کے "مرحوم و مغفور" با
اُس کے ساتھیوں میں پائے گئے تھے۔ پس اس حساب سے اگر آپ دُنیا
میں ذرا غور سے دیکھیں تو ایسے بے شمار "سقے کے بچے" نظر آئیں گے جو
خواہشات کے لحاظ سے زندہ قسم کے سقّے کے بچے ہیں، اب یہ ہم کیوں
کہیں۔ کہ ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں یا نہیں۔ البتہ اگر آپ دیکھیں کہ
ایک نوجوان سا ٹکٹ کلکٹر جب انگریزوں کے پاجامے کو اپنی
ہندوستانی ٹانگوں میں اُلجھا کر پلیٹ فارم پر کھڑا ہوتا ہے تو اس
حرکت کو تو اس کی "نوکری" کہہ سکتے ہیں۔ پھر اگر وہ گداگروں، محتاج
اور بے دست و پا مسافروں کو بے ٹکٹ ریل میں جانے نہیں دیتا تو
یہاں تک بھی اُس کی "نوکری" کہلائیگی۔ لیکن جب یہ ٹکٹ کلکٹر زنانے
ڈبے کے پاس بار بار دیکھا جائے، یہ عورتوں کو ٹکٹ دیکھنے کے بہانے
گھورے، یا دھمکائے، یا وہ غریب اور محتاج مسافروں کے سر
یا کمر پر اپنے انگریزی جوتے سے "دو چار ڈیم فول" بھی مارتا نظر آئے تو
اب اسے ریلوے کا بچۂ سقا کہنا عین قانون و انصاف ہے۔

فرض کیجیئے کہ ایک دس بارہ گز قد کا مسلمان ہے۔ رنگ کے لحاظ سے وہ بالکل ہی خضاب لاجواب ہے، مگر اس کے چہرے پر کوئی ڈھائی فٹ کی دودھ سے زیادہ سفید داڑھی ہے، وہ لال رنگ کی وردی بھی پہنے ہے، اس کے ہاتھ میں موٹے موٹے دانوں کی ایک تسبیح بھی ہے جس کی ہر حرکت کے ساتھ اُس کی ڈاڑھی کے ایک حصہ کو بھی حرکت ہوتی ہے۔ اس کے پاس ہی ایک بانس کا پور انصف حصہ لٹھ بنا ہوا رکھا ہے۔ اور وہ ایک ایسے دروازہ کے پاس اسٹول پر بیٹھا ہوا ہے جس پر چلمن پڑی ہوئی ہے، اب اگر آپ اس دروازے کے اندر ہاتھ میں اسٹامپ یا درخواست لیکر داخل ہوئے چلے جارہے ہیں، تو یہ "خضر سی صورت کا" علیہ السلام، اگر آپ کے بالکل منہ پہ ہاتھ رکھکر اس طرح روک دے جیسے آپ کسی کے طمانچے سے ٹکرا گئے ہوں یا کسی کا طمانچہ آپکے منہ پر پڑا ہو، تو یہاں تک کا معاملہ اُس کی نوکری کہلائے گا۔ لیکن اگر وہ کہے کہ ابھی آپ اندر نہیں جا سکتے، صاحب چائے پی رہا ہے، یا سو رہا ہے، یا ناچ رہا ہے یا گانے والا ہے یا اس وقت نہیں مل سکتا بلکہ دسمبر کے مہینے میں ملیگا بس جائیے جائیے زور سے بات نہ کیجیے پھر یکایک یہ کہے کہ لیجیے بھیہ اسٹول اس پر تشریف رکھیئے تو خیر میں کس لائق ہوں، آپ کی

مہربانی ہے، اچھا تو ٹھہریے میں اطلاع کرتا ہوں' اور ابھی ابھی آپکو صاحب سے ملائے دیتا ہوں تو سمجھ لیجیے کہ اب یہ چپراسی نہیں رہا بلکہ "دفتری بچہ سقا" ہوگیا، یوں کہنے کو یہ رشوت خوار مشہور نہ ہو۔

فرض کیجیے کہ آپ کے بزرگ افغانستان میں مذہب اسلام کے ہمالہ سے اونچے علمبردار تھے لیکن اتفاق سے وہ ہندوستان آگئے کہ یہاں آتے ہی انہیں فوج میں عہدہ مل گیا۔ پھر ان کے اولاد پیدا ہوئی اور اسی اولاد میں سے ایک صاحب نے پہلے اپنی مذہبی قومی ملکی اور آبائی خصوصیات کو ترک کیا۔ پھر یورپ والوں کا پاجامہ پہنا، پھر پانیر اخبار خریدنا شروع کیا تو یہاں تک نوبت ہوئی نوکری کی ضرورت تھا لیکن پھر اس نے نماز ترک کی، پھر روزہ پھر ڈاڑھی کے ساتھ ہی مونچھیں اکھاڑ کر پھینک دیں، پھر زمین پر بیٹھکر روٹی کھانا چھوڑ دیا تو یہ سب کچھ تو ہوا تمدن کا اثر، لیکن جب اس نے ٹھیک ۱۱ بجے رات کو پیانو باجا بجا کر ایک گلاس شراب کا نوش کیا تو آپ بتاتے ہیں کہ وہ اب بھی بچہ سقا ہوا یا نہیں؟۔

فرض کیجیے کہ ایک شخص اپنے خاندانی شرف ووقار بیان اپنے آپ کو قندھار و کابل سے زیادہ اونچا اور بڑا تصور کرتا ہو، اس کی اولاد اسکول میں تعلیم پاچکی ہو اتنی کہ فیشن کی ہر بات سے واقف ہو

اتنی کہ شام کے وقت ٹینس اور کرکٹ کا ناغہ نہ کرتی ہو۔ اتنی کہ پوڈر سے چہرے کو ہر وقت چمکاتی رہتی ہو، اتنی کہ ریشم و اطلس کے سوا کسی دوسرے کپڑے کی قمیص پہننا حرام سمجھتی ہو، اتنی کہ ہارمونیم بانسری فونوگراف اور، پیانو کی قسم کے تمام باجے بجا سکتی ہو اتنی کہ سر کے مشرقی بالوں کو کاٹ کر پٹے رکھا چکی ہو، اتنی کہ شلوار اور غرارے کی قسم کی "پاجامی" کے عوض ساری سے کام لیتی ہو (یہاں پاجامی عورت کے پاجامے کو کہنا صحیح ہے)، اتنی کہ لیڈیز کلب کی ممبر ہو چکی ہو اتنی کہ والد صاحب کی اجازت سے گھر کے نوجوان ملازم کے ساتھ رات میں سینما کا تماشا دیکھنے جاتی ہو یا جا سکتی ہو اور والد صاحب اس اطمینان میں مبتلا ہوں کہ یہ نوجوان ملازم میرا وفادار ملازم اور پروردہ ہے تو ان حالات کے حساب سے اس قسم کا والد تو ہوا بچہ سقا اور اُس کی اولاد ہوئی "بچی سقی" (یہ بچی سقی مرکب اضافی نہیں بلکہ ملا رموزی کے غصہ کی بگڑی ہوئی تانیث ہے۔

فرض کیجئے کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں اتنے بڑے کہ آپ کو آنریبل بھی کہہ سکتے ہیں اور حضور بھی پھر فرض کیجئے کہ آپ کے دو چار سفید سفید رنگ کے لڑکے بھی ہیں اتنے سفید کہ افغانی کہیں انہیں۔ اور اتنے سرخ کہ قندھاری کہیں جنہیں۔ وہ اب کسی اسلامیہ کالج میں پڑھتے ہیں وہ شلوار

اتار کر لکھنوی چست پاجامہ بھی پہن چکے ہیں وہ ریشم کی نظر سوز قمیص اس طرح پہنتے ہیں کہ اندر سے ریشم کی رنگین بنیان بھی نظر آتی ہے وہ سر کے بالوں کو یوں سنوارتے ہیں کہ ایک ہزار دلہنوں کا سنگار اسے شرماتا ہے۔ گویا وہ نوجوان مرد نہیں۔ بلکہ ایک ایسی دلہن ہوتے ہیں جو اسکول کی پہلی گھنٹی سنکر شرماتی ہوئی اسکول جا رہی ہو فرق صرف یہ ہو کہ دلہن کی آنکھوں کو اُس کے دوپٹے کا گھونگھٹ چھپائے رہتا ہو اور ان سفید لڑکوں کی آنکھوں کو وہ نازک سا چشمہ ہو جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں دن میں ایک لاکھ جادو جگاتی ہوں، پس ان اداؤں اور زنانہ دلفریبیوں کے ساتھ جب کوئی سفید رنگ کا لڑکا اسکول جاتا نظر آئے اور اُس کا باوا اس زنانہ پن پر اس سے کچھ بھی نہ کہے اور اسکول کا ماسٹر بھی اُسے دیکھکر خوش ہو تو بتایئے کہ اس قسم کا باپ اور بیٹا کون ہوا اور اس کا ماسٹر کون؟ قاعدے کے حساب سے اس قسم کا بچّہ تو ہوا "بچّہ سقا" اور باپ اور ماسٹر ہوئے اس کے سید وحسین کہ اعانت مجرمانہ میں ان دونوں نے اس لڑکے کا ساتھ دیا۔

فرض کیجئے کہ آپ ہیں "سپاہی ذات" اور آپ ریل کے کسی ایسے ڈبہ میں بیٹھے ہیں جس میں آپ کے سوا کوئی دوسرا مسافر نہیں۔ کہ یکایک کسی چھوٹے اسٹیشن سے آپ کے ڈبے میں ایک گھبرایا ہوا مسافر

سوار ہونا چاہیے اور آپ اُسے دھکا دیکر پلیٹ فارم پر اس طرح سے گرا دیں کہ ادھر مسافر مع بستر پلیٹ فارم پر گرے اور ادھر ریل روانہ ہو جائے تو ایسی صورت میں آپ ہوئے کابلی بچّہ سقا کے ہندوستانی ریکروٹ" پھر فرض کیجیے کہ آپ نے بی اے پاس کیا۔ گھر میں کھانا ترک کر کے ہوٹل میں تناول شروع کیا، پھر آپ نے ایک اخبار جاری کیا۔ پھر تقریر شروع کی، پھر کھدّر کا لباس پہنا۔ پھر جلوس نکلوایا۔ پھر چندہ جمع کیا۔ پھر ان تمام باتوں کے بعد آپ نے انسانوں کے مختلف طبقات میں شدید نفرت و فساد کی آگ بھڑکا دی۔ تو اس حساب سے آپ ہوئے بچّہ سقا اور آپ کی حرکات ہوئیں بچہ سقا کا توپ خانہ۔

پھر فرض کیجیے کہ آپ نے نہ لکھا نہ پڑھا مگر نام رکھ لیا، محمد فاضل' پھر آپ نے ایک ڈھیلا سا کرتہ پہنا۔ پھر ٹخنوں تک دو گز اونچا پاجامہ، پھر موٹا سا عمامہ پھر گلے میں تسبیح پھر قطب صاحب کی لاٹھ کے برابر داڑھی پھر اس جہل و بےخبری پر آپ نے بغیر کسی لائسنس - اور سرٹیفکیٹ کے اپنے کو پیر صاحب ظاہر کیا، پھر ایک قبر کے قریب گھر بنایا اور اُس کا نام رکھا خانقاہ - پھر آپ نے عرس کیا۔ پھر قوالی۔ پھر تعویذ لکھنا شروع کیا۔ پھر اُن حالات کے ساتھ جب شریعت و طریقت سے یکسر بےخبر لوگوں نے آپ کا مرید ہونا شروع کیا تو آپ نے عورتوں کو

بھی بیعت کی دعوت دی۔ اور جب عورتیں آپ کے پیرانہ اثر میں آگئیں تو آپ ایک دن رات کے تین بجے اُس مقام سے فرار ہو گئے اس طرح کہ ایک مرید آپ کی اور اپنی نئی بیوی یا جوان بیٹی کی تلاش میں ہر کوتوالی میں حلیہ لکھاتا پھرا مگر نہ آپ ملے نہ اُس کی بیوی تو اس حساب سے آپ تو ہوئے "بچہ سقا" اور آپ کی یہ تمام ظاہری اسلامیت اصول اور مذہب اسلام کے حق میں ہو گئی "بغاوت" پھر آپ نے فرار کے بعد جس گاؤں یا شہر میں قیام فرمایا وہ ہو گیا آپ کا کابل اور آپ ہوئے وہاں کے "سقوی شاہ"۔

فرض کیجیے کہ آپ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو مذہب اسلام کی جملہ روایات کا حامل تھا، آپ ہوش سنبھالتے ہی علوم دین اور مشرقی تعلیمات کے حصول کے پابند کر دیے گئے۔ آپ کا ماحول وطن و آزادی کا احترام کرنے والا رہا۔ آپ احکام اسلام کی بجا آوری پر اس درجہ مستعد بنا دئے گئے کہ آپ کا دماغ وطن اور مذہب کی محبت سے مالا مال ہو گیا۔ آپ نے بزرگوں کے احکام و اقوال کی عزت کی۔ وطن و ابنائے وطن کی آزادی اور فراغت کے لیے ہر خدمت کو فرض زندگی اور وظیفۂ حیات سمجھا اور اپنے برگزیدہ فرائض کی بجا آوری سے کبھی غافل نہ رہے کہ اسی

حالت میں آپ کو یورپ جانا پڑا۔ پھر آپ یوروپ گئے، مگر اس طرح
کہ وہاں نہ آپ نے باپ دادا کا پاجامہ پہننا ترک کیا۔ نہ ڈانس میں
شریک ہوئے نہ کسی میخانہ میں نہ ڈربی میں گھوڑے کا ٹکٹ خریدا نہ،
فرانسیسی عورت سے شادی کی، لندن میں بھی نماز پڑھی اور پیرس میں
بھی، نہ "ہلال احمر" کے نام سے چندہ جمع کیا نہ ووکنگ میں مسجد کی تعمیر
کے لیئے، نہ ترکوں کے خلاف خفیہ کارروائیاں کیں۔ نہ ڈاڑھی منڈوائی
پھر ان حالات کے ساتھ جب آپ وطن واپس آئے تو اسلام کو اسلام
سمجھا اور بزرگوں کو بزرگ قرآن محترم کو قرآن محترم سمجھا اور علماء کو علماء
وطن اور ابنائے وطن کی امن و آزادی کے لیئے اتنی کوشش کی کہ جان کو
خطرے میں ڈالدیا۔ اب اگر ان خطرناک حالات سے آپ موت کے منہ
سے بچ گئے تو ساری دنیا کی عزتیں آپ پر نثار ہو ہیں اور اس حساب سے
آپ ہوئے شاہ نادر خاں تاجدار افغانستان۔

پھر فرض کیجیئے کہ آپ نے اس قسم کا ایک مضمون لکھا تو آپ ہوئے
مُلّا رموزی اور جس رسالے نے اس کو شائع کیا وہ ہوا رسالہ "ادیب"
پشاور" کہ کہاں ہے۔

دفتری ملازم

کہتے ہیں کہ اگر گھوڑے کی قسمت پھوٹ جائے تو وہ ٹانگے میں لگایا جاتا ہے اور انسان کی قسمت پھوٹے تو وہ دفتر میں ملازم ہوتا ہے، ہندوستان میں تقریباً ۵۰ فی صدی لکھے پڑھے لوگ دفتروں میں ملازم یوں بھرے نظر آتے ہیں جیسے ریلوں کے تھرڈ کلاس ڈبوں میں ایک کے اوپر ایک مسافر بیٹھا کرتے ہیں۔

ان میں ہر قسم کی قابلیت کے بشر ہوتے ہیں مگر اسے خدا کا قہر ہی سمجھیئے کہ ذوق اور احساس کے لحاظ سے سب ایک رنگ، ان کے ذوقیات میں یوں تو وائسرائے سے لیکر "پیسہ اخبار لاہور" اور مسلم لیگ سے لیکر جمعیتہ الاقوام جنیوا تک کی مشرقی حکمت عملی کے رموز و نکات سے دلچسپی لینا داخل ہوتا ہے لیکن اس دلچسپی کے لوگ ان میں اتنے ہی ہوتے ہیں جتنا آٹے میں نمک یا نمک میں آٹا۔ البتہ دفتری طبقات میں عام مذاق کا جو رنگ غالب ہے اُسے ہم "دفتریت" یا دفتری پن

کہہ سکتے ہیں یہ دفتری پن ۹۹ فی صدی ہندوستانیوں کی حیاۃ عامّہ حیاۃ اجتماعی، اور اخلاق کو جس درجہ برباد و بہ ہم کر رہا ہے اگر اُس کے اثرات پر گاندھی بھی کبھی ایک نظر ڈال لیں تو امید کہ وہ باردولی کی ستیہ گرہ اور لاہور کی کانگرس کے اجلاس کو اس وقت تک ملتوی کر دینے کی تحریک فرمانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جب تک کہ اُن دفتری بھائیوں سے ان کی دفتری تاریکی کو دور کر نیکا مچلکہ نہ لکھوالیں۔

دفتری بھائیوں کو اگر ہندوستانی قرار دیا جائے، ان کے حقوق کو مینو سپلٹی سے لیکر کانگرس کی صدارت تک سے تسلیم کرالیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اس مقصد کے لیئے دُنیا کے کسی ایک ہندوستان میں بھی ان کی کوئی انجمن ہے؟ یہ وہ بدقسمت طبقہ ہے جو تعداد کے لحاظ سے تو دنیا کے تمام انگریزوں سے زیادہ ہے لیکن بے حسی اور بے خبری کے لحاظ سے وہ قابلِ ذکر بھی نہیں اور جو آج تک ان دفتری لوگوں کی ترقی اور تنخواہ کے اضافوں کے لیئے کوئی آل انڈیا کانگرس نہیں سو اس کا سبب ان کی وہ تاریک ذہنیت ہے جس کی تفصیل پر آج کا مضمون ہم ضائع کر رہے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ بحیثیت انسان کسی ایک آدمی کے ذمہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ صبح کا کھانا کھائے، ڈکار لے، جمائی لے۔ اور

انگڑائی لیتا ہوا شام کو پھر کھانا کھانے بیٹھ جائے، اور بیچ کا تمام وقت ایک دفتر میں گذار دے بلکہ عقل و ہوش اور علم و تمیز کا لازمہ یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں انسان گاندھی بھی بنے اور اُسی وقت چندہ بھی جمع کرے، اُسی وقت وہ ذاتی مصارف کے لیئے کپڑے کے بڑے بڑے کارخانے قائم کرے اور قومی چندہ ہضم کر جانے سے بھی باز نہ رہے وہ اسی وقت قوم کی خدمت کے نام سے ایک روزانہ اخبار جاری کرے اس میں اپنے دورے اور تقریر اور تقریروں کی تعریفیں خود بھی لکھے اور اپنے ملازموں سے بھی لکھوائے مگر نہ شرمائے اور چند روز کے بعد اس اخبار کو بند کر کے وصول کیا ہوا چندہ اپنے بیوی بچوں کو کھلا دے وہ لیڈر بھی بنے اور کوئی دواخانہ بھی قائم کرے خواہ یہ انگریزی ہو یا یونانی، وہ خود تو کھدر کا لباس پہنے لیکن اس کے بقیہ رشتہ دار انگریزی سوٹ بوٹ پہنیں مگر نہ لیڈر ان رشتہ داروں کو ڈانٹے اور نہ یہ رشتہ دار اس کھدری لیڈر کو برا کہیں، اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنا کھائے اور اپنا پہنے مگر گاندھی کو ہر حال میں جھک کر سلام کرے اور ایک وقت بھی گاندھی سے یہ نہ کہے کہ آپ کا بدن اور چہرہ رعب دار نہیں اور نہ لیڈر ہونے کا اس سے اثر پڑتا، اس پر فرض ہے کہ وہ مسلمان لیڈر بھی کہلائے اور ایک نماز بھی نہ پڑھے اُسے افریقہ

بھی جانا چاہیئے اور حیدر آباد بھی کیوں کہ ان دونوں مقامات کی آبادی کو جس قدر اصلاح کی ضرورت ہے ہندوستان کے ایک شہر کو نہیں اُسے ہندو مسلم فساد میں چانٹے بھی کھانا چاہیئے۔ اور پھر ان چانٹے مارنے والوں کو "برادران" وطن بھی کہنا چاہیئے، اُسے لیڈر ہو کر تھرڈ کلاس میں ریل کا سفر کرنا چاہیئے کہ جب لوگ اُس کے استقبال کو اسٹیشن پر پہنچیں تو وہ فرسٹ کلاس میں صاف بیٹھا ہوا نظر آئے، اُسے ملا رموزی کے مضامین پڑھے بغیر چین بھی نہ آنا چاہیئے۔ اور ملا رموزی کے لیئے کوئی زرِ نقد کی تھیلی بھی نہ بھیجنا چاہیئے غرض ایک انسان ہو کر دس انسانوں کے کام کرنا ہر ذی ہوش انسان کے لیئے اُس قانون کی رو سے جائز ہے جس کی رو سے ملک ہندوستان میں بغیر فوج کے انگریزوں کی حکومت قائم ہے۔ مگر اللہ میاں کے یہ کروروں دفتری بندے ان تمام ذمہ داریوں سے کچھ اس خوش اسلوبی کے ساتھ بری ہو کر رہ گئے ہیں کہ جواب نہیں ان کی بلا سے فلسطین میں یہودیوں کی امداد کے نام سے امریکہ کے دوسرے یہودی بھی آکر آباد ہو جائیں یا عربوں کے چانٹے رسید کئے جائیں، مگر یہ دفتری بھائی کبھی غور نہ کریں گے کہ ترکوں کو حکومت کے زمانہ میں گورنمنٹی لارڈ بالفور نے یہودیوں کے لیئے فلسطین میں وطن

بنانے کی کوئی تجویز پیش کیوں نہ کی؟ کیا برطانیہ کے قبضہ سے پہلے دنیا کے سارے ہندو یہودی تھے یا قادیانی؟ فیلڈ مارشل مصطفےٰ کمال پاشا نے یونانیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر یورپ سے اسلام کے خارج کیے ہوئے جھنڈے کو پھر قسطنطنیہ پر لہرا دیا، اور ترکی قوم کو زندگی اور ترقی کے عرش پر لا بٹھایا۔ مگر ہندوستان میں اُس کے لیے جب خبر آتی ہے تو یہ کہ وہ دہریہ ہو گیا اور ملحد ہونے میں تو دیر نہیں سو ایسی خبریں کیوں بھیجی جاتی ہیں؟ ان دفتری بھائیوں کو اس کی بھی تلاش نہیں کہ عین اُس وقت جبکہ انگریزوں کا بچہ بچہ بالشویک حکومت کا دشمن تھا تو یہ اپنے پنڈت موتی لال نہرو کو ماسکو جانے کی اجازت کیوں دی گئی اور وہ جب ماسکو اور مصطفےٰ کمال پاشا سے مل کر واپس آئے تو انہیں نظربندی اور جامہ تلاشی سے کیوں بری کر دیا گیا؟ یا گورنمنٹ کی اس قدر رعایتوں پر اُنہیں ہندوستان کا آزاد خیال اور آزاد عملی لیڈر کیسے مانا جائے۔ اُنہیں خبر نہیں۔ کہ مسلمانوں کے امیر گھرانوں میں لڑکی کی شادی سوائے بی اے پاس آدمی کے غریب آدمی کے ساتھ کیوں نہیں کی جاتی؟ یہ لوگ اخبار نہیں پڑھتے اور اسے بیکار سی چیز سمجھتے رہتے ہیں۔

یہ لوگ صبح جس وقت تک چاہیں سوتے رہیں لیکن دفتر کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے انہیں بیدار ہونا پڑتا ہے، منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوئے تو دفتر کی تیاری کا ہنگامہ شروع ہو گیا، فوراً ہی بیوی سے کہا۔

"کیا آج غیر حاضری نہیں ہو گی جواب تک کھانا نہیں تیار نہیں اور یہ دیکھو یہ میرے پاس نہ الائچی ہے نہ لونگ"۔

"اے نیک بخت وہ آج مہتم صاحب ایک گھنٹہ پہلے دفتر میں پہنچ جائیں گے تب تو میں جلدی کر رہا ہوں ورنہ کیا مجھے کُتّے نے کاٹا ہے جو میں تمہیں تنگ کروں، پرسوں ہی کا قصہ ہے کہ جو میں دفتر میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اکیلے بیٹھے خود ہی کام کر رہے ہیں وہ تو کہو کہ مراد آباد کے رہنے والے ہیں بڑے شریف آدمی اور ماتحت نواز افسر ہیں کچھ بھی نہ کہا ورنہ دوسرا افسر ہوتا تو وہ فوراً ہی غیر حاضری لکھ دیتا۔

"لاحول ولا وہ چھتری کہاں ہے؟ ارے تمہارے سامنے اسی تخت پر تو رکھی تھی" تو آخر یہاں سے کوئی شیطان لے گیا۔؟ اور وہ جو ایک سُرخ رنگ کا کاغذ تمہیں دیا تھا، خدا کے لئے اُسے نہ کھو دینا وہ سرکاری کاغذ ہے"۔

غرض صبح سے جب تک گھر میں رہے دفتر ہی دفتر کے حالات ضروریات

اور واقعات پر گفتگو فرماتے رہے اور جو زیادہ روشن خیالی سے کام لیا تو اس طرح کہ :-

کیا کہوں کل میرے پاس روپے نہیں تھے ورنہ ساڑھے نو سیر چاول بک رہے تھے پیشکار صاحب بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے خرید لیے اُنھوں نے کہا بھی کہ اماں کچھ تو تم بھی خرید لو مگر میں خرید کر لاتا تو کس طرح ؟ اس لیئے میں نے بہانہ کر دیا کہ میں پچھلے مہینے میں خرید چکا ہوں۔"

جس وقت دفتر کی طرف روانگی عمل میں آتی ہے تو اس شان اور آن بان کے ساتھ گویا اب سیدھے جاکر تخت طاؤس ہی پر جلوہ افروز ہو کر رہیں گے۔ تمام راستہ دفتری دوستوں سے جو گفتگو ہوتی رہتی ہے وہ بھی اس طرح کہ:-

"کیا فرمایا ؟"

"وہ اشرف علی صاحب"

"ہاں ہاں کہیئے پہچان گیا، ارے صاحب وہ پہلے سکرٹریٹ میں ریکارڈ کیپر تھے۔ جب ججی قائم ہوئی تو وہ ہمارے سامنے یہاں پیشکار مقرر ہو کر آئے، پھر وہ تحصیل میں بدل گئے۔ جب وہ خان بہادر محمد صدیق صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے اور یہ ہم منشی اشرف علی صاحب اُن کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ میری تو

اُس وقت سے اُن سے ملاقات ہے۔

"اماں مولوی سراج الحق صاحب کے ہم زلف ہیں اور یہ غلام احمد صاحب کے مکان کے برابر والے مکان میں رہتے ہیں" ہاں تو یوں کیوں نہ فرمایا،

"ہاں ہاں ۱۹۲۶ء میں وہ تھانیداری کے امتحان میں بھی شریک ہوئے تھے مگر اُس زمانہ میں افسر امتحان تھے سید الطاف علی یہ تھے شیعہ اور بڑے متعصب اُنہوں نے بیچاروں کو فیل کر دیا تو یہ کوئی چار پانچ ماہ تک بیکار رہے تھے اور اُدھر خدا کی شان کہ سید الطاف علی بھی رشوت ستانی کے مقدمہ میں برطرف کر دیئے گئے۔ جی ہاں تو اب اشرف علی صاحب ہی کے نوٹ پر مسل پیش ہوا کرے گی، کیا فرمایا نہیں۔

"جناب وہ بڑے کثر سنی ہیں اور بڑے خلیق، خدا بخشے میری نانا جان غفران مکان سے اور ان کے چچا سے بڑی دوستی تھی، ہمارے گھر میں بھی ان کے ہاں آنا جانا تھا مگر وہ تو جب یہ ۱۹۳۷ء میں بریلی بدل گئے تو اُس وقت سے پھر کوئی سلسلہ نہ رہا، آدمی بڑے شریف ہیں۔

آج خدا کی شان کہ وہ یکایک یہ ہو کر آ گئے۔ خیر بھائی ہمیں اس سے کیا ہمیں تو جب تک ملازمت کرنا ہے تو اگر کوئی بھنگی بھی افسر ہو کر آئے گا تو تابعداری کو حاضر ہیں اور ویسے بھی میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے کام میں مستعدی دکھانا چاہیئے۔

دوسرے بولے :۔

ذرا تیز چلیئے ۹ منٹ باقی رہ گئے ہیں'' مگر ہاں وہ خوب یاد آئی آج تو وہ (افسر) کمیٹی میں جائیگا اور ویسے بھی وہ مراقی آدمی ہے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ دفتر ہی چلا آئے یا کمیٹی میں جائے' وہ تو خاصا کرسٹان ہے' اس میں انسانیت کہاں' واللہ بہت دق کرتا ہے' ہاں تو وہ وجہ بھی تو معقول ہے' اسے صاحب وہ ڈپٹی کلکٹر کا سفارشی ہے اس کے خلاف کون سنتا ہے۔ واللہ گدھا ہے گدھا اسے کام وام تو آتا نہیں ہے وہ تو کہیئے کہ سر رشتہ دار مل گیا ہے کارکردہ بس وہ سب کچھ کر کے رکھ دیتا ہے۔ بھائی صاحب کے سامنے اور بھائی صاحب دستخط فرما دیتے ہیں''

بالکل سچ کہا آپ نے، بھائی صاحب یہ زمانہ ہی ایماندار کا

نہیں، آپ دیکھتے ہیں میں نے بیس برس کمشنری میں کام کیا
۹ سال جج میں ہوئے کسی ملعون نے آج تک یہ بھی نہ پوچھا
کہ تم نے اپنی نمک حلالی کا کیا صلہ پایا۔ یعنی جب میں نے
منشی نصیر احمد سے چارج لیا ہے اس وقت دیکھتے آپ
کام کی گندگی۔ واللہ ایک کاغذ اپنی جگہ درست نہ تھا
دفتر سے ایک کاغذات کی گٹھری باندھکر لیجاتا تھا اور تمام
رات اُنہیں درست کرتا تھا مگر آج اس اندھے کو یہ بھی
پتہ نہیں۔ کہ اُس کے کس ماتحت نے کیسا کام کیا، اب
تو بس سفارش ہو پھر اُس کے تین خوف معاف ہیں۔
"وہ دیکھیئے نا آخر کو مولوی وحیدالدین صاحب مرحوم
نے اسی ناقدری سے تنگ آکر پنشن ہی لے لی۔ مگر اس
کی چالیس برس کی ملازمت میں بس پندرہ ایک مرتبہ اور دس
ایک مرتبہ اضافہ ہوگئے حالانکہ وہ اس وقت سیکرٹریٹ
میں ایک ہی اہلکار تھا دیکھیئے ہٹ آیئے وہ موٹر آرہا ہے
کون کون؟
اس موٹر میں کیا جج صاحب تھے، اماں نہیں وہی جارہا ہے
ابو نانک چند۔ جی ہاں وہی جو جوڈیشل میں جو ہیڈ کلرک ہے

اور بنیاک والے صاحب کے ساتھ مراد آباد سے آیا ہی
اُفوہ کس بلا کا آدمی ہے بس آتش کا پرکالا کہئے، پورا
جوڈیشل آج اس کے ہاتھ میں ہے۔

اس قسم کے مباحث سے راستہ طے کیا اور دفتر پہونچکر جو مسلیں لکھنے کے لیے، سر جھکایا تو کوئی دو بجے جا کر بقدر پان سگریٹ اور بیڑی جمائی لیکر کام سے علحدہ ہوئے اور پھر پل پڑے کا غذات پر تو شام ہی کو فارغ التحصیل ہوئے اور دفتر سے فارغ ہو کر گھر تک راستہ ترکاری اور سودے سلف کے تذکروں اور مذاکروں میں کاٹ کر آ پڑے پھر گھر میں یوں کہ شب کے آٹھ بجے ہی کھا پی کر خراٹے لینا شروع کر دیا۔

ہیڈ کلرک صاحب کا دماغ اور رتبہ ان عام دفتری لوگوں سے قدرے بلند ہوا کرتا ہے، انہیں صاحب کی قربت اور شفقت پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ اور اسی بل پر یہ اپنے ماتحت ملازموں کو ڈانٹ تک پلانے پر آمادہ رہتے ہیں۔ ان کا اجلاس بھی ذرا خاص ہوا کرتا ہے۔ دفتری "لکھ پڑھ" میں یہ خود کو علامہ رازی سمجھتے ہیں، اور اسی لیے انہیں گھمنڈ ہوتا ہے کہ دنیا میں ہیڈ کلرک کے کام کے مقابل کوئی قابلیت کا کام ہی نہیں۔ ان کے لہجے اور گفتگو میں ہیڈ کلرک پن کا

نخرہ ضرور شامل ہوتا ہے، افسر کی خوشامد سب سے آگے اور
دفتری واقعات تو خون بن کر بدن میں ہر وقت دوڑتے رہتے
ہیں۔ بات بات پر مسل کا حوالہ دینے کو بڑی مورخانہ سعادت سمجھتے
ہیں۔ ماتحت ملازموں کو غیر حاضری جرمانے اور چغلی سے کبھی چھوڑتے
نہیں، ہر غلط کار اہلکار کی اصلاح کرتے وقت اپنے قدیم افسران
کے عہد میں اپنی پابندی اور مستعدی کے حالات کو بڑی عبرت
انگیز داستان بنا کر سناتے ہیں۔ تاکہ دوسرے ماتحت بھی
غلامی اور خوشامد کے عادی ہو جائیں، دفتری کاغذات کے
ایک ایک پرزہ سے واقفیت حاصل کرنے کو اپنی قابلیت کا
ہرٹیفکٹ سمجھتے ہیں اور مسلیں لکھنے میں اس قدر دلچسپی لیتے
ہیں کہ دو بکس کا غذات گھر پر بھی لا کر لکھتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ
کبھی ہونہ دفتر میں تعطیل ہو تو یہ اکیلے ہی دفتر میں پہونچکر لکھتے رہتے ہیں
اور اسے اپنی مستعدی کا آخری ثبوت سمجھتے ہیں؛

دنیا کے دوسرے حالات میں صرف اس قدر شریک ہوتے
ہیں کہ کبھی کبھی محلے میں میلاد شریف کی مجلس میں چلے جاتے ہیں
ورنہ ہر لمحہ دفتر یاد آتا ہے۔

دفتریات میں سپرنٹنڈنٹ، منصرم یا سر رشتہ دار کا عہدہ

بھی خاص چیز ہوا کرتا ہے، اس عہدہ کے ہندوستانی زادے ماتحت ملازموں سے ہنسکر بات کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں ان کے غرور اور گھمنڈ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کے گھر میں بھی ہر وقت اسپرنٹنڈنٹی قایم رہتی ہے ان کا اجلاس عام ملازموں سے وزرا اعلیٰ علیحدہ اور اوٹ میں ہوتا ہے ان کا ہمیشہ افسر اعلیٰ کی تعریف، خوشامد اور بڑہیا قسم کی رشوت ستانی ہوتا ہے۔ یہ لوگوں سے بہت کم میل جول رکھتے ہیں، اپنے افسر کی مہربانیوں کا ذکر بڑی اہمیت سے فرماتے ہیں یہ بھی دفتری واقعات کی انسائیکلوپیڈیا ہوتے ہیں، افسر کے بنگلے پر روزانہ جانے کو دارین کی سعادت سمجھتے ہیں۔ ان کے مکانوں پر ارباب حاجت واصحاب ضرورت کا روزانہ دربار ہوتا ہے اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کسی عمدہ سی آرام کرسی پر بڑے فخر سے پڑے ہوئے عرض وضاحت سنا کرتے ہیں اور غرض والوں اور محتاجوں کو ہمیشہ اس قسم کے جوابات عطا فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ معاملہ اب میرے اختیار سے باہر ہے تصفیہ تو صرف صاحب ہی کہ سکتے ہیں، ہاں میں جو کچھ ہو سکے گا صاحب سے آپ کے لیے عرض کردوں گا"!

اس رتبہ کے محض دفتری لوگ محض خلافت ایجی ٹیشن ۔

بھوک ہڑتال اور مہاتما گاندھی کی جے سے صرف اس قدر بیدار ہوئے ہیں کہ کبھی کبھی اخبار زمیندار پڑھ لیتے ہیں یا صاحب کا اخبار "پائنیر"۔ ان کے مکانوں پر دفتر کے چپراسی سودا سلف بھی لاتے ہیں اور حقہ بھی بھرتے ہیں۔

ان سے جو دز ایلند ہو جائیے تو پھر والحفیظ، ان کے بعد آخری افسر آتے ہیں، ان کے دفتری اقتدار اور پندار کا عالم بھی نرالا ہوتا ہے۔ جتنا مرحوم و مغفور لوگوں کا فرشتوں سے، ان کا دماغ افسری کے نشہ سے ہمیشہ سرشار رہتا ہے اور ماتحت انسان تو ان کی نظر میں کوئی چیز ہی نہیں ہوتا۔ جب چاہا ڈانٹا اور جب چاہا برطرف فرمایا۔ جب چاہا خوش ہو گئے اور جب چاہا ناراض۔ ان کے تعلقات محلے والوں سے بھی نہیں ہوتے اور شہر والوں سے بھی نہیں۔ بس یا صاحب بہادروں یا خان بہادروں سے، ان میں سے بعض اپنا لہجہ انگریزوں کا سا بنا لیتے ہیں۔ اور گفتگو تو سراسر انگریزی میں۔ ان لوگوں میں "پائنیر اخبار" پڑھا جاتا ہے اور اپنی مادری زبان کے اخبار "زمیندار" سے نفرت کی جاتی ہے عام مسلمانوں اور ہندوؤں کی بساط نہیں جو ان کے مکان پر آسانی سے ملاقات یا عرض حال کر سکیں، ہاں وہ ایک ضروری بات تو

بھول ہی گئے اور وہ یہ کہ ان تمام اقسام کے دفتری لوگوں میں یہ جہالت
یہ حماقت، یہ غلط فہمی اور یہ گھمنڈ مشترک ہوتا ہے کہ دفتر کی کارروائیوں کو
یہ اس درجہ قابلیت کا کام سمجھتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس کام کو ایک
مضمون نگار ایسا فاضل انسان بھی نہیں کرسکتا حالانکہ ایک مضمون نگار
ہی ہوتا ہے جو دفتر تو دفتر ایک پوری حکومت کا نظام مرتب کر کے رکھ
دیتا ہے مگر ان لوگوں میں مضمون نگاری اور چیز ہے اور دفتری گھسیٹ
یا دفتری نستعلیق اور،

الغرض ان میں کا ہر ایک کسی نہ کسی وقت خود کو سقراط و بقراط ہی
سمجھتا ہے مگر قابلیت یہ کہ نہ انشا درست نہ املاء بس چھپے ہوئے رجسٹروں کے
خانے بھر دینا اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں معاملہ کو طے کر دینا ہی اپنا انتہائی
"منشی جی پن" سمجھتے رہتے ہیں، پھر مصیبت یہ کہ اس جہل و کم سوادی پر
یہ نہ گاندھی کو خاطر میں لاتے نہ ابوالکلام آزاد کو۔

بے خبری کا یہ عالم کہ دفتر کے باہر نہ کانگریس کی اہمیت سے خبردار نہ
مسلم لیگ کے مقصد سے واقف، نہ شاہنشاہی حکومت کا مطلب سمجھیں
نہ جمہوری حکومت کے فوائد، نہ وضع قوانین کے اصول و ضرورت کا علم نہ
انصرام حکومت کا سلیقہ کام کرنے کا سلیقہ یہ کہ ۹۹ فیصدی دفتری لوگ
تاریک سے کمروں میں بیٹھ کر لکھتے ہیں تو انہیں صحت کی کبھی شکایت

نہیں ہوتی، اور مقررہ اوقات سے سوا لکھتے رہیں تو اُنہیں دماغی ضعف کا غم لاحق نہیں ہوتا بس ایک مشین ہوتے ہیں جو چکر کھاتی رہتی ہے، اور بس،

غرض یہ وہ بے حس اور بے خبر طبقہ ہے جو اگر بیداری سے متمتع ہو جائے تو ہندوستان میں روشن خیالی کی ۵ ، فیصدی کمی پوری ہو جائے پھر کیا ممکن ہے کہ کوئی پنجابی بھائی اُٹھے اور اس بے کس طبقے کی اصلاح و ہدایت اور ترقی اور بیداری کے لیے ایک اخبار "دفتر" کے نام سے جاری کر دے۔ مان لیجئے کہ اس قسم کا اخبار بے شمار دفاتر میں بیحد مقبول ہوگا، بشرطیکہ اس کا ایڈیٹر بھی کوئی پنشن زدہ اور دقیانوسی قسم کا ہیڈ کلرک ہو اور اخبار میں بجائے اجتماعی اور بین الاقوامی مسائل کے عرصۂ دراز تک مراسلہ آفس کاپی ڈی، او، ورقہ حکم، مسل حکام بالا کی خوشامد، دفتر کی حاضری کے طریقے، تعطیل کے دن کام کرنے کے اصول۔ تنخواہ میں اضافہ کرانے کے گر سفارش حاصل کرانے کے اصول اور بال بچوں کے ساتھ رہنے کے ضابطے لکھتا رہے کہ یہی چند چیزیں ہیں جن کے اندر دفتری بھائیوں کی

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے — عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

رہا افسروں کے غرور اور گھمنڈ کا علاج سو اس کا جواب تو مخفی رکھتے ہیں

سبب یہ ہے کہ ایک فاتح قوم جب مفتوح قوم کے افراد سے درا
نخوت اور غرور سے فطرتاً پیش آتی ہے تو مفتوح افراد میں اقتدار
پسندی یقینی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر ہندوستانی
افسروں کو ڈانٹنے اور چانٹا مارنے کے لیئے انگریز ہاتھ نہیں آتے
تو وہ اس جذبہ کو اپنے ہی ملکی اور قومی ماتحت ملازموں پر حکومت
فرما کر پورا کر لیتے ہیں۔

اسی لیئے تو ہمارے ننھے میاں کی والدہ کو دفتر کی روزانہ حاضری
پسند نہیں، غنیمت ہی ہے ان کا اتنا ہی احساس، خدا ہم دونوں کو
بعافیت و فراغت سلامت رکھے۔ آمین۔

طلبہ کا سفر

ارتقاء طبعی کے تحت جہالت آباد ہند کے باشندوں کی ذہنیت بدل رہی ہے۔ سیاست، تجارت۔ زراعت، تمدن تعلیم۔ مذہب، معاشرت، ادب اور بین الاقوامی حالات و اوضاع میں ایک ہلکی سی تبدیلی ہے جو بتدریج بڑھ رہی ہے، اور ارتقاءً اور ترقی کی یہی وہ روح ہے جو اُن کی حیاۃ و زندگی کے ہر شعبہ میں بیدار ہو رہی ہے، اور یہی وہ روح ہو سکتی ہے جو سعیٔ پیہم یا کسی حادثہ کے اثر سے ایک دن ہندوستانیوں کو متمدن۔ اور عروج یافتہ اقوام کے ہم پایہ بنا دے گی۔

ارتقاء و انقلاب کے جذبات سے کون ہے جو خالی نظر آتا ہے؟ سینوں میں اگر جوش ہے تو انقلاب و ارتقاء کا دماغ میں خیالات ہیں تو علوّ و برتری کے، ارادہ ہے تو اصلاح و ترقی کا، یہاں تک کہ اختلاف و فساد ہے تو وہ بھی اپنی حیاۃ و زندگی کے تحفظ و تجدد کا غرض ہندوستان کا وہ میلا اور گندہ مزدور جسے اگر فرصت ملتی

تھی تو " بمقدار چلم نوشی " اگر اُس کی جد و جہد کا میدان تھا تو۔
" از غریب خانہ تا بہ کارخانہ " مگر آج بھی مزدور ہے جو ہر اجتماعی
تحریک میں سب کے ساتھ شرکت کو تیار نظر آتا ہے وہ استقلال
و حریت تہذیب و تربیت کی ہر تقریر سے مانوس ہے اور حیات مستقل
کی ہر آواز کو سنتا ہے اور بہت غور سے سنتا ہے، پھر اسی ماحول
اور ارتقائی جذبہ کا اثر ہے کہ مسلمان بھی کروٹ بدلنے کی آنکھ
کھول رہے ہیں۔ وہ اپنی خبیث اور ملعون عادت کو ترک کرنے
چلے تو ہیں مگر کافی ذلت اور خواری کے بعد، موٹر، گھوڑ دوڑ سینما
تھیسٹر، تیتر بازی، مرغ بازی اور شراب خواری سے بیزار تو
ہو رہے ہیں مگر پوری بربادی اور برہمی کے بعد، اور ارتقاء طبعی کا
بھی وہ تاثر ہے کہ اب مسلمانوں میں خبائث و سیئات اور مکروہات
و ممنوعات کے ترک کے ساتھ ہی ایک نہایت خفیف مگر واقعی حرکت
ہے جو دیرینہ کسل و غفلت کے پہلو میں انگڑائی لیتی نظر آ رہی ہے،
اُن میں بھی سیاست و استقلال، تمدن و تہذیب اصلاح
و معاشرت کی ہر آواز سُنی جا رہی ہے مگر اس قدر ثقیل و قلت کے
ساتھ گویا کہ ابھی کچھ بھی نہیں۔
اُن کے ذہنی اور فکری اعمال کی ترقی تاریک و تنگ دل سگاہوں

سے نکل کر اسکول۔ کالج اور یونیورسٹیز کی بلند اور شاندار عمارتوں تک پہونچ گئی ہے مگر اس طرح گویا وہ کوئی ایسا جمیل و رنگین خواب دیکھ رہے ہیں۔ جس کی تعبیر اُن کے لیے مہلک تر ہے۔ بس انہی کیفیات کے ساتھ آپ مسلمان طلبہ کے ایک ایسے سفر کے حالات سُن لیجیئے جو حصول علم و تحقیق حقائق کی خاطر کیا گیا تھا۔ اور اس طرح کہ اپنے ملّا رموزی صاحب بھی اُن کے ہمراہ تھے۔

عرصہ سے سُن رہے تھے کہ آجکل کے اسکولوں اور کالجوں سے طلبہ کو ہندوستان کے۔ تاریخی، جغرافی، اور علمی مقامات کے معائنہ کو اس لیئے بھیجا جاتا ہے کہ وہ "عملی تعلیم" کے فوائد سے بہرہ ور ہوں اور یہ اس طرح کہ اُن کے ساتھ اُن کے اساتذہ بھی ہوتے ہیں جو ہر علمی اور تحقیقی موقع پر طلبہ کو واقعی درس دیتے جاتے ہیں لیکن قبل اس کے کہ آپ اس سفر کے حالات معلوم کریں یہ جان لیجیئے کہ آج کل کے اسکولوں اور کالجوں میں یہ اپنے محلہ کے شیخ بدھو اور حافظ کلّا کے لڑکے تعلیم نہیں پا سکتے۔ بلکہ وہ تعلیم پاتے ہیں جن کے والد ماجد اور نہیں تو کہیں کے ڈپٹی کلکٹر ضرور ہوں۔ پھر ایک کلکٹر زادہ کے لیے یہ بات آسان نہیں کہ وہ تحقیق علم کی خاطر افغانی جفاکشوں کی طرح بغیر کسی امداد کے مساجد کی خیراتی روٹیوں

اور زکوٰۃ کے موٹے موٹے کپڑوں کو پہن کر بھی ڈٹا رہے۔

مگر حصول علم سے منہ نہ موڑے اب تو جب تک اسکول کے لیئے سائیکل موزے۔ ٹائی۔ سکارف۔ ریشمی شیروانی۔ چست زنانہ پاجامہ اور ڈاسن کا پمپ نہو تو اسکول جانا کیسا؟ پھر اسکول پہونچکر ہاکی اور فٹ بال کا بوٹ۔ نیکر۔ سلک کی بنیائن، بالوں کی آرائش کے لیے پیرس اور لنڈن کا تیل اور کھیل کے بعد سوڈا واٹر برف اور لیمجوس کی بوتلیں نہ ہوں تو پھر اسکول میں دلچسپی ہی کیا؟ اس حالت کے ساتھ طے پایا کہ فلاں دن فلاں وقت فلاں فلاں کے ساتھ فلاں ریل سے فلاں شہر جائیں گے تاکہ وہاں کے آثار علمیہ کا معائنہ کیا جائے۔

اسکول سے سفر کے خرچ کا انتظام ہو گیا مگر اس سے ہوتا ہی کیا ہے؟ ہر طالب علم اپنی اپنی ماں اور اپنے اپنے باپ سے چار چار سوٹ چار چار بوٹ چار چار بکس چار چار سگریٹ کیس اور چار چار داڑھی صاف کرنے کے اُسترے مع تولیہ۔ صابون اور پوڈر کے طلب گئے اس پر بھی ایک بولے۔

"بھئی ہم کیا خاک جائیں؟"

"کیوں؟ اماں موزے تو فقط پانچ جوڑے ہی ہیں۔

اور میرے پاس بھی تو یہ چار ہی پاجامے ہیں، مردود دھوبی نے اب تک دھو لئے ہی نہیں۔

"تو تمہاری طرح میں تو ہوں نہیں۔ کہ چاہے کچھ ہو یا نہ ہو مگر سفر ضرور کریں"

"اچھا تو آگرہ بھی تو راستہ میں پڑے گا وہاں سے خرید لینا میں بھی تو آگرہ ہی سے چست پاجامے خریدوں گا کیونکہ آگرہ میں جو "شاعرانہ پاجامے" ملتے ہیں وہ تم خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے"

"لاحول ولا تو کیا یہاں سے میں ننگا ہی چلوں؟"

"اماں ننگا کیوں چلو۔ آخر اتنا تو ہے کہ وہاں تک چلے چلو"

"جی نہیں مجھے تو معاف کیجئے ذرا والد صاحب دفتر سے آجائیں ان سے ایک مرتبہ اور کہوں اگر دیدئے تو خیر ورنہ بھئی میں تو اس حالت سے نہیں جاؤں گا۔"

"اماں کیوں نخرہ کرتے ہو چلے بھی چلو واللہ بڑا لطف رہے گا۔

گویا سفر کا مقصد علمی تحقیق وکاوش نہیں بلکہ "لطف" قرار پایا۔ غرض اس قسم کی تکرار اور تیاری کے بعد "مقررہ فلاں تاریخ"

اور فلاں وقت پر۔ فلاں ریل، پر پہونچ گئے، دیکھا تو طلبہ کی تعداد سے
کہیں زیادہ تعداد صندوقوں کی تھی جن کے اندر قیمتی جوڑے کپڑے کے
پا پیر اخبار۔ انگریزی ناولیں، سیفٹی ریزر، صابون، تولیے، بوٹ اور
چشمے یوں بھرے ہوئے تھے گویا کسی گرل اسکول کی۔ صاحبزادی کا
فیشن ایبل جہیز ہے جو ریل پر بار کیا جانیوالا ہے۔ اور اس میں نسوانی
اور زنانہ بناؤ سنگھار کی ایک چیز بھی کم نہیں۔ لیکن واضح ہو کہ کسی
جغرافی یا تاریخی کتاب کا اس پورے سامان میں پتہ بھی نہیں تھا اور
جانماز کا تو ذکر ہی بے موقعہ ہے۔

ہمارے "ننھے میاں کی والدہ" گو تنخواہ مل جانے کی وجہ سے
ہم سے کسی قدر خوش بھی تھیں۔ مگر اس سفر کے لیئے اُنھوں نے اس حال
میں بھی ناشتہ کی روٹیوں کے اوپر فقط پانچ روپے عطا فرمائے تھے۔
بستر کی چادر دھوبی کے ہاں سے آئی نہ تھی اس لیئے فقط ایک "کار
آزمودہ کمبل" تھا جو ہمارے بستری وقار کے لئے کافی سمجھا گیا،
اور چونکہ سفر تھا صرف چار دن کا اس لیے صرف ایک جوڑا کپڑے کا
کافی سمجھ لیا گیا اور اُسے اخبار زمیندار لاہور کے بیچ کے دو ورقوں میں
یوں باندھ دیا۔ گویا آگرہ شو فیکٹری سے سات نمبر بوٹ خرید کر لائے ہیے
ہیں، قمیص کی جیب میں کاغذ کے ٹکڑے اور انگریزی سیاہی بھرا ہوا

قلم رکھ دیا گیا" تاکہ معاوضہ کی مضمون نگاری کا ناغہ نہ ہو"۔ ریل کے
کرایہ کا خود طلبہ نے انتظام کر لیا تھا اور وہ بھی سکینڈ کلاس کا اس لیے
ہم نے سوچ لیا کہ یوروپ میں بھی مضمون نگار اسی طرح سفر کرتے
ہوں گے پھر ہم کیا بُرے ہیں۔

لڑکے تھے اسکول کے اور وہ بھی انگریزی زبان کے اسکول
کے اس لیے انگریزوں نے یہ قاعدہ بنا دیا ہے کہ جب کسی اسکول کے
لڑکے کسی انگریزی قسم کے علم کی تحقیق یا کسی انگریزی قسم کے کھیل تماشہ
کے لیے سفر کریں تو ریل والے ان سے آدھا کرایہ لیں شاید اس سے
مقصد یہ ہے کہ یوروپی آداب و اثرات کی اشاعت ہو ورنہ جناب
یہ اپنے دیوبند کے طلبہ کیا طلبہ نہیں ہیں جو بیچارے تھرڈ کلاس میں بھی
ٹکٹ نہیں جا سکتے۔ اس لیے ہماری جماعت کی طرف سے ہیڈ ماسٹر
صاحب نے سٹیشن ماسٹر صاحب کو انگریزی زبان میں پہلے ہی
لکھ دیا تھا کہ:-

ہمارے طلبہ چوں کہ فلاں مقصد کے لیے فلاں شہر تک
فلاں ریل سے فلاں ماسٹر کی نگرانی میں فلاں دن
فلاں تاریخ اور فلاں بجکر فلاں منٹ پر سفر کریں گے
اس لیئے ان کے واسطے فلاں قسم کے ڈبہ میں فلاں

فلاں قسم کی سیٹیں عرف نشستیں وقف و خاص کر دیجئے
تاکہ کسی دوسرے یا تیسرے مسافر کو اس ڈبے میں
"تاب گھس پڑے" نہ رہے امید کہ آپ فلاں قاعدے
کے موافق فلاں مقدار کے ٹکٹ تیار فرمادیں گے۔

واضح ہو کہ ہندوستانی ریلوں کے محکموں میں جو ہندوستانی ملازم ہیں اُن کی ذہنی۔ مذہبی اخلاقی، اور علمی قابلیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ یوروپ کے مسافر کو خود جھک کر سلام کرتے ہیں اور اپنے قومی و ملکی اور دینی بھائیوں کو ادنیٰ سے ادنیٰ ذلت اور تکلیف پہونچانے میں کبھی کمی نہیں کرتے اور یہ فقط اس لیے کہ ریلوں کے ہندوستانی ملازمین میں ایک بھی ایسا نہیں ملیگا جس نے دیوبند ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں دینی اخلاق اور علوم کی کامل تعلیم پائی ہو اور مشرقی خلق و کرم اور ہندوستانی خلوص و ہمدردی اخبار بمبئی ٹائمس اور پانیر اخبار پڑھنے والوں میں نہ پیدا ہوئی ہے نہ ہو۔

یا پھر ریلوں کے محکموں میں وہ انگریز ملازم ہیں جو قانون کے پابند ہیں اور قانون میں صاف لکھا ہے کہ "گاڑی صرف تین منٹ ٹھیرگی"۔ اس لیے باوجودیکہ ہم میں کا ہر طالب علم لباس اور چہرہ کی

صفائی کے لحاظ سے لانڈ جارج سے کم نہ تھا بعض کے ہاتھ میں تو
تازہ اخبار پانیر بھی تھا مگر گاڑی آتے ہی سب کو دھکے بھی کھانا پڑا
اور مسافروں کی گالیاں بھی، کسی کا چشمہ ٹوٹ گیا اور کسی کے بکس کا
پالش اڑ گیا۔ غرض سوار ہوتے وقت طلبہ میں نہ کوئی "نسوانی نزاکت"
باقی تھی نہ مزاجوں میں انگریزی دانی کی اکڑ، اور تو اور قلی مزدوروں
تک پر رعب باقی نہ رہا اور اُنھوں نے صندوق پر صندوق یوں
دے مارا گویا وہ کسی پردیسی تاجر کے پارسل ہیں جو یک سے پلیٹ
فارم پر پوری بیدردی سے پھینکے جاتے ہیں آمارے نہیں جاتے۔
نشستوں میں گنجایش کا یہ حال تھا کہ ہر مسافر اپنے پاس والے مسافر
کی کسی نہ کسی چیز پر بیٹھا ہوا تھا، ہمارے رہنما وہ ماسٹر تھے جو ہندستانی
کچومر ہونے پر بھی آج ہیٹ سوٹ میں یوں پھولے ہوئے تھے۔ گویا
کل سارے ہندوستان کے گورنر جنرل باجلاس کونسل وہی ہوں گے
آئے اور سیٹی بجاتے ہوئے سیکنڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔ صرف لڑکوں سے
اتنا کہہ گئے کہ دیکھو بھئی ہشیاری سے بیٹھنا۔
ریل روانہ ہوئی وقت تھا رات کا اور وہ بھی کوئی اڑھائی بجے
شب ادھر ہم تھے مصروف طلبہ کی امداد میں نتیجہ وہی ہوا جو دنیا میں
نیکی اور احسان کا ہوا کرتا ہے یعنی ریل روانہ جو ہوئی تو ہمارا اسکینڈ کلاس

بھی روانہ ہو گیا گھبراہٹ میں ایک تھرڈ کلاس منہ کے سامنے آ گیا تو اس پر خواہ مخواہ لٹک جانا پڑا۔ اب جو لٹک کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو اندر سے کسی نے جھنجھلا کر ہمیں ایسا دھکا دیا کہ اگر دروازہ باہر کی طرف کھلنے والا ہوتا تو گئے تھے ملا رموزی صاحب "جوارِ رحمت" میں اب فکر یہ ہوئی کہ آخر دروازہ نہ کھولنے کا سبب کیا ہے ادھر ریل لمحہ بہ لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے اور ہم تھے کہ ڈاکہ زنوں کی طرح ڈبے سے چپٹے کھڑے تھے، جب دروازہ کھولنے کے لیئے زور آزمائی کرتے تو ہم سے زیادہ زور اندر کی طرف سے ڈالا جاتا۔ پھر سوچا کہ آخر یہ اسکولوں میں "رسہ کشتی" تو سنی تھی مگر یہ ریل میں "دروازہ کشتی"، آجتک نہ سنی، بہرحال ہمیں تو دروازہ کھولنا ہی تھا ورنہ کچھ ریل سے گر کر خودکشی کے لیئے تو سوار ہوئے نہیں تھے، اس لیئے چاروناچار دروازہ پر دستک دینا شروع کیا تو اس کا جواب بھی کچھ نہ ملا۔ مگر ہم کاہے کو باز رہتے تھے اب جوں جوں ریل تیز رفتار ہوتی اتنی ہی طاقت سے ہم دروازہ بجائیں۔ ہلائیں۔ ٹھونکیں۔ کوٹیں پیٹیں۔ بھڑبھڑائیں۔ جھنجھوڑیں۔ کھولیں۔ دھکائیں۔ اٹھائیں۔ بٹھائیں کھینچیں، مگر نہ کھلے تو دروازہ سے کان لگا کر سوچیں کہ یہ اندر کے بیٹھنے والے کہیں اناللہ تو نہیں۔ ہو گئے؟ کبھی سوچیں کہ ہو نہ ہو اس

ڈبے میں ہمارے کچھ دوست ہیں جو جان بوجھ کر محض مذاق کے طریق پر ہمیں تنگ کر رہے ہیں تو اس خیال سے ہم کہیں۔

"اماں بس رہنے بھی دو اب مذاق وذاق، چلو دروازہ کھولو۔"

"لاحول ولا اور جو ہم نیچے گر گئے تو واللہ ہڈیاں بھی نہ ملیں گی۔

"اونھ تو اس سے فائدہ؟"

"ہم ایسا مذاق تو پسند نہیں کرتے۔

"اماں واللہ ریل پوری رفتار سے جا رہی ہے۔ دیکھو اگر گارڈ نے دیکھ لیا اور ریل کھڑی ہو گئی تو جیل خانے بھیج دیئے جائیں گے، کیونکہ وہ تو سمجھے گا کہ ہے یہ کوئی اٹھائی گیرا۔ لفنگا۔ چور۔ ڈاکو۔ جو ریل کے باہر کھڑا مسافروں کے اسباب کی تاک میں ہے"

"تو آخر مذاق کی بھی کوئی حد ہے؟"

لاحول ولا۔ اچھا تو لو اب نہ کہیں گے۔ نہ کھولو۔ قسمت میں یوں ہی مرنا لکھا ہے تو مر جائیں گے۔ استغفراللہ یہ بھی کوئی مذاق میں مذاق ہے۔، اچھا تو نہ کھولو گے۔

یہ سب کچھ ہم اسی خیال میں کہہ رہے ہیں گویا ڈبے کے اندر واقعی کچھ دوست بیٹھے یہ سب کچھ سن ہی تو رہے ہیں حالانکہ واقعہ یوں تھا کہ سارے مسافر پڑے سو رہے تھے اور ایک مسافر نے دروازہ کے قریب ہی بستر جما کر اپنے پاؤں دروازہ سے یوں اڑا لیے تھے کہ دروازہ کے ساتھ ہی ان کے پاؤں بھی کھلتے تھے اس لیے وہ پاؤں کو دروازہ سے پوری قوت کے ساتھ لگائے پڑے ہوئے تھے اور باہر سے زور لگانے سے چونکہ اُن کی نیند خراب ہو چکی تھی اس لیے وہ مارے تاؤ کے دروازہ بھی نہیں کھولتے تھے، مگر تا بکیے آخر ہمارے مسلسل شور اور زور سے تنگ آکر ایک مرتبہ اُٹھ کر یوں دروازہ کھولا کہ ہم اتنے زور کے ساتھ ریل میں منہ کے بل جا پڑے۔ نواب جھنجھلا کر بولے کہ یہ چلتی ریل میں کہاں گھس رہے ہو؟۔

اس وقت ہمیں اس قدر تاؤ تھا کہ اس مسافر کو جہنم واصل کر دیں مگر اپنی پھانسی کے خوف سے دم بخود ہو کر بیٹھ گئے، تو بیٹھے یوں کہ اُن مسافر صاحب کا آدھا بستر اداب کر، اب اس پر ایک تازہ ہنگامہ اور شور ہوا اور مسافر صاحب کے جو جی میں آیا کہا مگر ہم نے ایک کا بھی جواب نہ دیا تو تنگ آکر چپ تو ہوئے مگر ہمیں رہ رہ کر یوں گھورتیں گویا ہم کہیں کے اُچکے اور گرہ کٹ ہیں جو اُن کے ڈبہ میں

چلتی ریل میں گھس آئے ہیں پھر بھی وہ چپ نہ ہوتے تھے تو ایک مرتبہ ہم نے بڑے انکسار سے اپنا نام یوں بتایا کہ حضور ہم ہیں۔

ضیاء الملک مُلّا رموزی، فاضل الٰہیات، ایم۔ آر۔ اے

ایس۔ لندن، موجدِ گلابی اردو۔

مگر یہ نام نہ اُن کی سمجھ میں آنے والا تھا نہ آیا۔ اور ویسے بھی دفتری قسم کے مسلمانوں کی نظر میں ایسے ناموں کی قیمت ہی کیا، اس لیے ہم نے کہا کہ بھائی! اصل میں ہم ہیں حضور نظام حیدر آباد کے اے ڈی۔ سی۔ اب تو گھبرائے اور فرمایا تو جناب یہ آدھی رات کو اس طرح کیوں سوار ہوئے؟ ہم نے کہا ہمارا اسیلون اسی ریل میں لگا ہوا ہے ہم حضور نظام کے لیے سوڈا واٹر لینے گئے تھے کہ ریل روانہ ہو گئی وہ بوتل بھی ہاتھ سے گر کر چور چور ہو گئی، خیر جان ہی بچ گئی۔ آگے کے اسٹیشن سے ہم چلے جائیں گے۔ اب تو پورا بستر دیدیا اور فرمایا کہ کوئی مضائقہ نہیں واقعی خدا نے بڑی خیر کی۔ اور جناب معاف کیجیگا میں سو رہا تھا اور کیوں صاحب یہ نظام حیدر آباد کہاں تشریف لیئے جا رہے ہیں۔ ہم نے کہا دہرہ دون جا رہے ہیں۔ وہاں وائسرائے سے خفیہ ملاقات فرمائیں گے۔ آپ کسی سے نہ کہئے گا، یہہ کہکر ہم نے انہیں سگریٹ پیش کیا تو اب یہ ہمارے اے ڈی سی ہونے کے قائل

ہو گئے تب خیال آیا کہ مسلمانوں میں علم ادب کوئی چیز نہیں۔ صرف سیکرٹری یا اے ڈی سی ہونا بڑی بات ہے۔ اور یہ اس لیے کہ مسلمان نے چارے علم و ادب سے خود بے بہرہ اور محروم ہیں۔ اُنہیں کسی کی علمی و ادبی حیثیت کا اندازہ ہو تو کیوں کر ہو، بھلا یہ انٹرنس پاس کیا جانیں ابو الکلام آزاد کی ادبی عظمت کو اور یہ ایف۔ اے پاس کیا پہچانیں مولوی ظفر علی خاں کے بہار آفریں انشاپردازی کو اور بی اے پاس کیا محسوس کریں مُلّا رموزی کی لطافت نگاری کو؟

الغرض دوسرے اسٹیشن سے ہم اپنے ڈبہ میں جو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ طلبہ کے بیچ میں ہارمونیم باجہ رکھا ہے اور ایک نزاکت مآب طالب علم صاحب یوں گا رہے ہیں گویا وہ اسکول کے طالب علم نہیں بلکہ منّی جان آگرہ والی کے ملازم ہیں، یہ گویا ریل میں تفریح ہو رہی تھی، ان کے مجمع کے صدر حضرت ماسٹر صاحب تھے جو نہایت آن بان سے بیٹھے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے۔ اور دوسرے طلبہ بھی محو سگریٹ نوشی تھے۔ اب فرمایئے کہ جو اُستاد طلبہ کے سامنے سگریٹ نوشی کرے اور طلبہ کو بھی اس نوشی کی اجازت دے وہاں شرم و حیا اور ادب و تعظیم کی مشرقی

رسم کس طرح باقی رہے ؟ - پھر یہ کہ شاگرد رشید کی قوالی میں شرکت آج کل کے اساتذہ کا ایک ضابطۂ تعلیم ہی سمجھ لیجئے - پھر جب بورڈنگ ہاؤس کا کوئی طالب علم او ستاد صاحب پر فوجداری کا مقدمہ چلا دیتا ہے تو کہتے ہیں کہ بڑا گستاخ ہے - تھوڑی تھوڑی دیر میں یہ گانے والے طالب علم صاحب اپنے استاد صاحب ہی سے سگریٹ طلب فرماتے تھے جن سے اُن کے اور اُستاد صاحب کے خوشگوار تعلقات کا پتہ چلتا تھا اور آج کل اسکولوں اور کالجوں میں ایسے خوشگوار تعلقات کا بہت زور ہے خصوصاً امیر خاندانوں کے طلبہ ان تعلقات میں بہت مستعد ثابت ہوتے ہیں - یا پھر ایسے افغانی گھرانے کے لڑکے جو کسی وقت بادشاہ افغانستان سے بغاوت کر کے اب ہندوستان میں دنیا جہان کی بے حیائی اور بے شری کے لیئے زندہ ہیں -

اب ہم جو اس ڈبہ میں داخل ہوئے تو ہم نے اس مشغلہ پر ماسٹر صاحب کو دھر لیا اعتراضات پر مثلاً ہم نے کہا -

کیوں ماسٹر صاحب کیا اسی کا نام ہے تعلیم و تربیت ؟

ماسٹر - کیا عرض کیا جائے - یہ آج کل کے فیشن نے طلبہ میں ایسی بیحیائی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے -

ہمم - مگر آپ تو اپنے اقتدار کو باقی رکھیں -

ماسٹر - اقتدار باقی رہتا ہے ڈنڈے کے بل پہ اور طلبہ کو ڈنڈے چھڑی لٹھ - گھونسے اور چانٹے سے مارنا اصول تعلیم کے منافی ہے ادھر یہ امیر گھرانے کے لونڈے ہوتے ہی ہیں بے شرم، بے حیا، بے حمیت اور بے غیرت، اور یہ سب کچھ سیکھ کر آتے ہیں - اپنے اُن بزرگوں سے جو خود آپس میں ایک دوسرے عزیز سے بے باکانہ اور بے حیائی کے معاملات میں باک اور شرم نہیں کرتے -

ہمم - ٹھیک ٹھیک، درست درست، بجا بجا، صحیح صحیح، واقعی واقعی - خود ہمارے دوستوں میں بھی ایسے خاندان ہیں جو اپنے سے چھوٹے بچوں سے کوئی حجاب نہیں کرتے اور انہیں الٹتہ طور پر ایسے مواقع بہم پہنچاتے ہیں مگر انہیں موت نہیں آتی پھر ایسے سفید رنگ کے طلبہ اور سرخ رنگ کے ماں باپ میں اُستاد کی عظمت و عزت کیا -؟

صبح ہوئی تو طلبہ سیٹیاں بجاتے ہوئے بیدار ہوئے - اور وہ اپنی سگریٹ منہ میں داب کر ریل کی "میونسپلٹی" میں لوٹا لیکر گئے وہاں سے آئے تو داڑھیاں اور مونچھیں یوں صاف کیں گویا وہ بھی دہلی کی عروس تو ہیں جو شام کے وقت آراستہ ہو کر

کوٹھے پر جانے والی ہیں۔ یا وہ زمانہ تھا جب نوجوان طلبہ اپنے سینہ اور شانہ کو تان کر چلنا مردانگی کی علامت سمجھتے تھے۔ یہاں سے پوریاں۔ دہی بڑے۔ پاپڑ۔ چائے اور گوشت روٹی، خریدی گئی اور یوں کھائی گئی کہ اسٹیشن کے تمام مسافر تماشہ دیکھتے رہے اس کے بعد ایک نے بانسری بجائی اور دوسرے نے گانا سنایا ایک صاحب پر علم و فضل کا جو زور ہوا تو انھوں نے بھر تازہ پانیر خرید لیا مگر اخبار زمیندار لاہور۔ کو اس لیے نہ لیا کہ وہ ان کی ماں کی زبان میں شائع ہوتا ہے۔

اب چل پہ چل اس شہر کے قریب پہونچے جہاں علمی و تاریخی تحقیق کا معاملہ طے ہونے والا تھا۔ گاڑی میں پھر ہل چل پیدا ہوئی اور طلبہ نے پھر نئے نئے سوٹ بوٹ سنبھالے اور بالوں کی آرایش اور چہروں کی زیبایش کو لاجوابی کی حد تک پہونچا دیا تو اس شہر کے لیئے ہم لوگ الٹا تماشہ بن گئے جدھر سے گزرتے لوگ ہمیں گھور گھور کر دیکھتے مگر نہ ہمارے طلبہ پر شرم طاری ہوتی تھی نہ خود ہمارے اوپر اور ماسٹر صاحب تو پہلے ہی معقول عذر فرما چکے تھے۔ تحقیق و تدقیق کے مرکز پر یوں پہونچے کہ طلبہ نے جاتے ہی انگڑائیاں لیں اور مع ماسٹر صاحب کے اُن آثار قدیمہ کے سامنے لیٹ گئے، کسی نے

کوئی قصہ سُنایا کسی نے ریل کا کوئی واقعہ، کسی نے کچھ دیر انگریزی بولی اور کسی نے کوئی شعر گنگنایا۔ تھوڑی دیر بعد آثار قدیمہ کے ایک پروفیسر آئے تو طلبہ ان کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ کوئی بیس منٹ تک اُنہوں نے لیکچر دیا اور ان سب نے سنا۔ نہ کسی نے اس لیکچر کا کوئی فقرہ نوٹ کیا، نہ کسی کتاب سے اسی وقت مقابلہ کیا، نہ اس خالص اور اہم علمی معائینہ پر طلبہ میں کوئی مباحثہ ہوا نہ کوئی نقد و جرح نہ آثار قدیمہ و علمیہ کی تحقیق ہوئی نہ تصیح بلکہ تحریک ہوئی کہ اب دھوپ سخت ہو رہی ہے قیام گاہ پر جلد چلیئے۔ طلبہ کے ساتھ جانے والے ماسٹر صاحب اس پورے علمی اور تاریخی لکچر میں یوں منہ کھولے کھڑے رہے گویا وہ طلبہ کے ماسٹر نہیں بلکہ چوکیدار ہیں یا چپراسی ہیں۔ جدھر طلبہ جاتے وہ مذاق فرماتے ہوئے اور سیگریٹ پیتے ہوئے ساتھ ہو جاتے، اس لیے طلبہ نے طے فرمایا کہ ماسٹر صاحب آج یہاں کی ہاکی ٹیم سے ہم میچ کھیلیں گے۔ ماسٹر صاحب نے اجازت دیدی۔ پھر طلبہ نے طے کیا کہ آج شب کو یہاں کا سینما دیکھینگے۔ تو ماسٹر صاحب نے اس کی بھی اجازت عطا فرمادی۔ کسی نے کہا تو سیسل ہوٹل میں ناشتہ نہ کیجیئے گا تو ماسٹر صاحب نے بڑے زور سے فرمایا کیوں نہیں؟ کسی نے کہا دو دن تو اور قیام کیجیئے پرسوں یہاں بڑا بھاری میلہ ہوگا

تو ماسٹر صاحب نے فرما دیا اچھا ٹھہر جائیں گے گھبراتے کیوں ہو۔؟ واضح ہو کہ اس تمام قیام میں ہم سے نہ کوئی سوال کیا گیا نہ کوئی تاریخی مباحثہ، البتہ ہم سے داڑھی صاف کرنے اور کپڑے بدلنے کا مطالبہ بہت جلد جلد اور اصرار سے کیا جاتا تھا اور یہاں ننھے میاں کی والدہ کا بخشا ہوا وہی ایک جوڑا تھا جسے گھر تک صاف ستھرا لیجانا بھی ہمارے شوہرانہ سلیقے میں داخل تھا۔

یوں سفر کرتے ہیں آجکل کے طلبہ، پھر ان سے ملازمانی زندگی میں عدل و انصاف، امانت و دیانت، مستعدی اور جفاکشی اور کسی ہنرمندی کی امید ایسی ہی ہے جیسی ہم ننھے میاں کی والدہ سے فرماں برداری کی توقع قائم کریں۔

ذرا کانپور تک

اچھا فرض کیجیے کہ آپ کوئی نہایت مقبول اور شہرۂ آفاق ادیب ہوں آپ کے حکمت زا اور بہار آفریں مضامین پر دنیا عقیدت واحترام کے پھول برساتی ہو۔ پھر آپ کو ایسی جگہ طلب کیا جائے جہاں سامان فراغت اور بلند سے بلند مرتبہ لوگوں میں آپ کے دیدار کے جذبات کی کمی نہ ہو اُس وقت اگر آپ کے "ننھے میاں کی والدہ" آپکو صرف پندرہ روپیہ سفر کے خرچ کے لیے دیدیں تو ایمان سے کہیے آپکا دل اور دماغ کتنے دن اور زندہ رہ سکتا ہے؟ نتیجہ یہی ہوگا کہ آپ تمام راستہ ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بدبو دار قسم کے مسافروں کے دھکے کھاتے چلے جائیں گے۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کا ایک نامور ادیب اس ریل میں سفر کر رہا ہے۔ اماں اور نوا اور وہ ہمارے ناشتہ کی روٹیاں بھی اخبار زمیندار میں یہہ کہکر لپیٹ دیناکہ برتن

کہیں بھول آؤگے ؛ تو گویا اس حساب سے ہوئے نا ہم گنوار آدمی ؟

۱۷ اگست کو بھائی محمد بشیر صاحب ، بی کام لندن بار ایٹ لا

آنریری مجسٹریٹ وینونسپل کمشنر کانپور کا ایک گورنمنٹ قسم کا خط ملا

کہ جلد آیئے دارالعلوم الٰہیات میں عید میلادالنبی کا مبارک و مسعود

جلسہ ہو رہا ہے ۔ بھائی بشیر ملک کے اُن چند ممتاز نوجوانوں میں سے

ایک ہیں جو ادب اردو اور مشاہیر اردو کے احترام و خدمت

کو بہترین خدمت تصور کرتے ہیں اور ہم چونکہ ممدوح کے اس ادب

نواز اور علم دوست جذبہ کو سمجھتے ہیں اس لیے فوراً ہی تیار ہو گئے

یہ اور بات ہے کہ ننھے میاں کی والدہ نے اس شان سے کانپور بھیجا

تھا کہ ریل کے تھرڈ کلاس ہی میں خودکشی کا ارادہ ہو گیا تھا ۔ بڑی

شان سے تو گیا بس خموشی سے ایک تنگ و تاریک ڈبہ میں بیٹھ

گئے ، غور کیجیے کہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ تو ہم نے اپنی کمائی کے روپیہ سے

خریدا تھا اور ہمارے سامان کو قاعدے سے رکھنے کا حکم دے رہی

تھے تھرڈ کلاس کے دوسرے مسافر تین بجے تک جو دوزانو ہو کر بیٹھے

ہیں تو حرکت تک نہ کی وہ تو یہ غنیمت ہے کہ ابھی گورنمنٹ نے

تھرڈ کلاس کے مسافروں کو دوسرے مسافروں کے قتل کر دینے کی

اجازت نہیں دی ہے ۔ ورنہ ہندوستان بھر کی ریلوں کے

تھرڈ کلاس میں سفر کرنے کا طریقہ یہ ہو جائے کہ ہر نیا سوار ہونے والا مسافر پہلے سے بیٹھے ہوئے مسافر کو قتل کرکے باہر پھینک دے اور خود اس کی جگہ بیٹھ جائے، اماں خدا کا قہر نازل ہو۔ یہ ہندوستانی کونسلوں کے ارکان پر کہ یہ بدبخت کبھی ریلوں کے تھرڈ کلاس مسافروں کی تکالیف پر کوئی سوال ہی نہیں کرتے اور پھر یہ برٹش ہندوستان کی آبادی کو دیکھیے کہ ایسے ارکان کو کونسل میں بھیجنے کے لیے کیسی پریشانیاں اُٹھاتی ہے۔؟ ریلوں کے تھرڈ کلاسوں کی یہ دق اور دمہ پیدا کر دینے والی حالت اس زمانے میں ہے جب ہندوستانی خود کو سوراج لینے کے قابل ظاہر کر رہے ہیں۔ اور ابھی کیا ہے ذرا موتی لال صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو کامیاب تو ہو جانے دو پھر دیکھیے گا جو ہر ہندوستانی افسر کے مکان پر ایک ایک ریل نہ بندھی رہے تو ہمارا ذمہ بس پھر ملا رموزی صاحب اونٹ پر سوار ہو کر کان پور جایا کریں گے اور ریلوں میں بیٹھے پھریں گے۔ یہ لیڈر اور لیڈرنیاں بس ایسے ہی حالات دیکھ کر ریل والوں نے بھی یہ طریقہ ایجاد کر دیا ہے کہ ریل کو اسٹیشن پر اتنا بھی نہیں روکتے کہ تھرڈ کلاس مسافر سکون سے پانی تو پی سکیں۔ واللہ ایک اسٹیشن پر بھی سکون سے وضو نہ کر سکے ابھی تین کلیاں بھی پوری نہ ہوئی تھیں کہ ریل نے سیٹی دیدی، اب بغیر وضو ہی ڈبے میں واپس آئے تو اپنی جگہ پر

تین نئے مسافروں کو یوں موجود پایا گویا ہماری جگہ اُن کے باوا کی، جاگیر/ادھی، اب یا تو اُن لوگوں سے عظیم الشان دنگل لڑیئے یا کھڑے ہو جایئے۔ گال سے ہاتھ لگا کر، بس اس طرح آپکے ادب اردو اور زبان اردو کے یہ لطافت نگار ادیب حضرتِ ملّا رموزی صاحب کان پور میں اس وقت پہونچے جب صبح کی طلعت بار ساعتوں میں بوڑھے۔ ضعیف۔ بیمار اور پنشن یافتہ مسلمان خدائے جلال و جمال کی بارگاہ میں غلامی و بندگی کا سر جھکاتے ہیں۔ اور علی گڈھ کے نوجوانوں سے لیکر خدا کی دی ہوئی بے شمار دولت کے مالک عرف مسلمان تاجر لوگ، کونسل کے مسلمان ممبر اور اسلامی اخبارات کے ایڈیٹر گہری نیند سوتے ہیں۔

پلیٹ فارم پر برادر عزیز محمد بشیر صاحب کے پرائیویٹ حضرت عبد الکریم صاحب ولی مانگرولی اور ممدوح کے مشیر تجارت ڈاکٹر آرنسٹ موجود تھے ہم نے کہیں غلطی سے ولی صاحب سے اتنا کہدیا کہ ہمیں نماز صبح پڑھنا ہے تو ممدوح نے ہمیں بڑے اعزاز کے ساتھ ایک قلی کے سپرد فرما دیا یہ کہہ کر کہ آپ کو اسٹیشن سے باہر والی مسجد میں پہونچا دو، قلی مزدور چونکہ اسٹیشنی جغرافیہ کے پروفیسر ہوتے ہیں اس لئے قلی صاحب ہمیں ریل کی پیچ بیچ پٹریوں سے یوں اُچھالتے ہوئے لے چلے کہ اگر ایک آدھ انجن ادھر سے گذر جاتا تو یہ آپ کے ادیبِ شہیر ملّا رموزی صاحب کسی پٹری پر دو

ٹکڑے نظر آتے ہے۔

نماز کے بعد ہمارا جلوس روانہ ہوا، باوجود بارش اور صبح صادق کے سڑکوں پر رعایا کا خاصہ ہجوم تھا، کہیں کہیں گنگا نہانے والے ننگ دھڑنگ ہندوستانی یوں جا رہے تھے اور یوں جا رہی تھیں کہ ان کے ہر بن مو سے ہزاروں مطلع اور شعر پیدا ہو رہے تھے۔ سب سے پہلے کانپور کی چکنی اور روغنی سڑکوں پر جو نظر پڑی تو اندازہ ہوا کہ برطانیہ کی حکومت نے کان پور کی رعایا سے ان سڑکوں کے لیے خوب خوب دام وصول کیے ہوں گے اور پھر دیکھنا لندن ٹائمز اخبار کسی دن اکڑ کر اعلان کرے گا کہ کان پور کی ساری رونق محض برطانیوں کے دم قدم سے ہے ان چمکدار سڑکوں پر جب کانپور کے لاکھوں گندے اور قحط زدہ صورت والے مرد اور عورتیں نظر آتی تھیں تو کانپوری رعایا کی خوشحالی کا اندازہ آسان ہو جاتا تھا، انہی سڑکوں کے کنارے کانپوری تاجروں کی وہ کوٹھیاں نظر آئیں جن کے اندر انگریزی معاشرت کا وہ نقشہ جما ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کے سر سے پاؤں تک میں یوروپ ایسا دھنس گیا ہے کہ اب نکالے نہیں نکل سکتا۔ ان کوٹھیوں میں دوا کے لیے بھی آپ کو کوئی ہندوستانی وضع کی چیز نہیں مل سکتی، فرش سے لیکر الماریاں، مسہریاں، کرسیاں، آئینے، غسل خانے، موٹریں، تصویریں

برقی روشنی، برقی پنکھے، ٹیلیفون، لونڈر، صابون، اور میونسپل بورڈ

تک میں انگریزی سامان اس کثرت سے کہ ایک ایک کوٹھی سے دس

دس لاکھ روپیہ انگریزی سوداگروں نے حاصل کیا ہوگا۔ اماں ان

کانپوری سوداگروں کی کوٹھی پہ کتّے تک یوروپ کے پلے ہوئے

ہیں۔ گویا ہندوستانی کتے کو شب کے وقت بھونکنا بھی نہیں آتا

بس ساری تہذیب اور وفاداری یوروپ ہی کے کتوں میں تو جا

گھسی ہے؟ غرض کانپوری سوداگروں نے یورپی معاشرت کو جس جوش

سے اختیار کیا ہے اس کی آخری حد یہ ہے کہ شب کے وقت یہ سوداگر

صاحب اپنی کوٹھیوں میں گنجفہ تک یورپی وضع کا کھیلتے ہیں اور اس

نخرے سے کھیلتے ہیں گویا وائسرائے ہند کے اے ڈی۔ سی، ہیں

تو یہ، اور جمہوریہ جرمنی کے صدر ہیں تو یہ غرض یورپ زندگی کی اس حد

کو پہنچ کر بھی ان بھائیوں کی حالت یہ ہے کہ نہ کونسلوں میں جگہ نہ کلکٹری

آسان، پھر یوروپ کی اس معاشرت پر دولت برباد کرنے والے

ہندوستانیوں کی نظر میں ذلت اس درجہ کہ بے وقوف سمجھتے ہیں تو

ملّا رموزی کو اور تمدن ناشناس جانتے ہیں تو ملّا رموزی کو،

ہاں تو ان تماشوں سے گزرتے ہوئے پہونچے بشیر صاحب کی خدمت

میں، بھائی بشیر نے جس گرمجوشی اور خلوص قلب سے معانقہ کیا اس کے

انداز سے یقین آیا کہ ابھی کانپور سے اسلامی اخلاق و تواضع کا
جنازہ بالکل ہی نکل نہیں گیا ہے، بس یہی ہوا کہ تھوڑی دیر تک وہ
ہمارے اندر جذب رہے اور ہم اُن کے اندر، فوراً ہی چائے منگائی
گئی اور چائے کے بعد مسلم جلیم ہائی اسکول کو روانہ ہوئے جہاں سرکار
دو عالم اور مصلح اعظم حضور احمد مصطفےٰ ارواحی فداہ کی تقریب ولادت کا
مقدس و محترم جلسہ تھا، اس اسکول میں پہونچے تو خواہ مخواہ علی گڈھ
کالج یونی ورسٹی سے کم نہیں، فرق یہ ہے کہ علی گڈھ میں برطانی جھنڈیوں
انگریزی عبارت کے مقولوں اور کتبوں سے کام لیا گیا ہے۔ اور یہاں
سب کچھ دیسی ہے یا مذہبی، کمرہ کے دونوں طرف جلیم لائبریری کی علوم و
فنون کی نایاب کتابوں کی الماریاں ہیں، لکڑی کے اسٹیج پر قالین کا
فرش اور حاضرین کے لیے دری کا فرش، مقررین میں مولوی سعید انصاری
ندوی رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ اور مولوی حافظ احمد اللہ خاص تھے۔ یا
مُلّا رموزی، جلسہ کے بعد اسکول کا معائنہ کرایا گیا جس کی وسعت کشادگی
اور پختگی کو دیکھ کر مسلمانوں کے محسن اور مخلص ہمدرد حضرت خان بہادر حافظ
حاجی محمد سلیم صاحب آنریری مجسٹریٹ و تاجر اعظم کانپور کی اولو العزمی اور ایثار
کی عظمت دوبالا ہوگئی، صرف اس اسکول کی تعمیر کے لیے حافظ صاحب
ممدوح کا ایک لاکھ روپیہ نقد دینا اس یوروپ پرستی کے زمانہ میں جس قدر

بھی قابلِ احترام ایثار کہا جائے کم ہے، اسی طرح دوسرے تاجرانِ چرم کا اس اسکول پر اپنا سب کچھ خرچ کرتے رہنا بتا رہا ہے کہ اگر مسلمانوں کے سر سے اُن کی حکومت کا سایہ اُٹھ گیا تو ابھی ایسے مسلمان موجود ہیں جو بے کس اور بے ذریعہ مُسلمانوں کی اولاد کو ذی علم اور ہنر مند بنانے کے لیے یوں تیار ہیں گویا قوم کے سارے بچے اُنہی کی اولاد ہیں۔ پھر بھائی بشیر کا بحیثیت ناظم اعلیٰ اس اسکول کی حیاۃ و ترقی میں سرگرم رہنا اُن نوجوان مسلمانوں کے لیے درسِ عبرت ہے جو سوائے چائے اور تجارت کے نہیں جانتے کہ دوسرے مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے۔

واپسی پر بھائی بشیر نے فرمایا کہ میرے ایک دوست حکیم مولوی سید اظہر حسین صاحب مدظلہ کو اس لیے ساتھ لیں کہ وہ مُلّا رموزی سے ملنے کے بڑے شایق ہیں، لفظ حکیم سے تو ہم بہت بدگمان ہوئے لیکن حکیم صاحب موصوف سے مل کر جو مسرت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے موصوف کے طبّی تبحر ادبی معلومات اور شعری مذاق کی بلند پائیگی کا اعتراف نہ کرنا حقیقت سے انکار کرنا ہے۔ خصوصیت سے وہ علم شعر کے بڑے بلند مرتبہ عالم ہیں، مجلسی مذاق اور اخلاق میں صرف اتنا پرانا پن باقی ہے کہ آپ مضطر خیر آبادی مرحوم کے خط و کتابت فیلو" رہ چکے ہیں ممدوح سے گلِ بنفشہ، گاؤزباں اور شربت نیلوفر کے حالات کو

چھوڑ کر اگر ان کے کوفتہ بیختہ شعری حالات ہی کو سن لیجئے تو اس کا سلسلہ امیرؔ و داغؔ کی صحبتوں سے جا ملتا ہے مزاج کے ہر گوشے سے اسلامی اخلاق اور مشرقی آداب و خلوص کی گنگا جاری رہتی ہے، حکیموں کا لباس یوں بھی ہر وقت "در آب تر کردہ و مالیدہ" رہا کرتا ہے لیکن اس پہ آپ میرے کا سرمہ اس کثرت سے لگاتے ہیں کہ آنکھوں کا غزالی پن تین دن تک بھی نہیں مٹ سکتا۔ شیروانی کے پورے بٹن لگانا آپ کے نزدیک حماقت ہے اور چھتری کو ہر حال میں سینہ سے لگائے رہنے کو بڑی قابلیت سمجھتے ہیں، دنیاوی دولت جو نہیں ملی ہے تو خلق حسن اور غیرت و خودداری کے وہ "جوشش دادہ زلال" بنے رہتی ہیں کہ بات کی تاب نہیں، صحیح معنی میں دوستوں کے کام آنے والے مگر زیادہ رات گذرنے پر باہر آنے کو برا سمجھتے ہیں، طب یونانی میں آپ کے بعض نسخے ایسے لاجواب ہیں کہ یوروپ بھی جواب سے عاجز،

آج کا دن کانپور کی ادبی اور صحافتی دنیا کی سیر کا تھا، موٹر تو خدا نے دلا دیا تھا بھائی بشیر کا پھر ہماری اکڑفوں میں کمی کونسی تھی۔ بڑی شان پہونچے کانپور کے ہونہار اور مستعد ادیب حضرت مولوی حاجی سید ابو محمد ثاقب ایڈیٹر "نظارہ" کے دولت خانہ پر، مولوی صاحب ممدوح کانپور

کے اُن نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی تربیت
اور شہرت میں مُلّا رموزی کی طرح صرف خدا کا فضل وکرم تو شریک ہے
اور کسی کا احسان نہیں، ممدوح محترم ہمارے اُن عزیز از جان دوستوں
میں سے ہیں جن سے ہم مالکیتی اور اُستاد بھائی کا دلنواز رشتہ ہے،
ہمیں دیکھکر جس قدر خوش ہونا چاہیئے تھا اُس سے بھی کچھ سوا ہی خوش
ہوئے، تھوڑی دیر میں آپکے دوست حضرت شیام کشور نور بھی تشریف
لائے یہ ہندو نوجوان ملک کے اُن مخصوص انشا پردازوں میں سے ہیں جو
ادب اردو اور زبان اردو کو اپنی مادری اور ملکی جہیز اور وراثت سمجھتے
ہیں، اور ابتدائی عمر ہی سے فسانہ نگاری کو شغل زندگی بنا کر آج مستعد
اہلِ قلم حضرات کی صف اول میں موجود ہیں، مُلّا رموزی سے بہت زیادہ
محبت فرماتے ہیں۔ اور اگر کان پور میں مُلّا رموزی رہ جائیں تو حضرت
ثاقب اور حضرت نور اُنھی کے پاس رہا کریں۔

برادرم ثاقب سے طے پایا تھا کہ وہ کان پور کی ادبی۔ اور
صحافتی دنیا کی سیر میں ساتھ رہیں گے۔ اس لیے سب سے پہلے ادب
اردو کے دیرینہ خادم حضرت دیا نرائن نگم۔ بی۔ اے، ایڈیٹر اخبار
آزاد اور رسالہ "زمانہ" کے گھر پہونچے رسالہ زمانہ کان پور، ملک کے
ان علمی، ادبی اور سیاسی رسالوں میں شمار ہوتا ہے جو تعصب اور

کوتاہ نظری سے بہت بلند رہ کر ملک وملت اور علوم مشرقی کی
گوناگوں خدمات انجام دے رہا ہے، حضرت دیا نرائن صاحب اطلاع
پاتے ہی باہر تشریف لائے اور بجید تپاک سے ملے۔ دفتر میں لے گئے
سیگریٹ اور پان ہم لوگوں کو یوں اپنے ہاتھ سے نکال کر پیش کئے
گویا وہ ان ڈبوں کو چھوت سے بچا رہے ہیں اس لیے کہ یہی ڈبے
پھر آپ نے ایک اور پنڈت صاحب کے سامنے بے تامل رکھدیئے
ہمارے مضامین اور کتابوں کے بڑے شائق ہیں تمام کتابوں کے
پتے لکھکر رسالہ زمانہ کے لیے ہم سے مضمون کی فرمائش کی معاوضہ کا
شکر فرمایا۔ اچھا تو خط وکتابت کی جائے گی۔ مزاج میں انکسار اور
تواضع کا رنگ خاصہ ہے ہم نے جب ممدوح کی ادبی خدمات کی
داد دی تو اُسی انکسار سے شکریہ ادا فرمایا اور باہر تک رخصت کرنے
آئے اور اسی مصروفیت میں یہ بھول گئے کہ مُلّا رموزی صاحب کو
رسالہ زمانہ کا کوئی پرچہ پیش کیا جانا چاہیئے تھا۔ ممکن ہے اب جاری
فرمادیں ایک تنگ وتاریک گلی میں چلے جا رہے تھے کہ ثاقب صاحب
نے فرمایا یہ ہیں حضرت مولانا، پلٹ کر دیکھا تو ادب وحریت کا وہ
آفتاب جلوہ فرما تھا جسے عرف عام میں مولٰینا حسرت موہانی، کہتے
ہیں، فوراً مصافحہ کیا پہلا ہی فقرہ ارشاد ہوا "کہ آپ کے تذکرے

سے تو کوئی اخبار خالی نہیں" اب آپ کو اپنا مستقل کام خود ہی کرنا چاہیئے" تو ہم نے سرمایہ نہونے کی شکایت کی تو بہت افسردہ ہوئے اور دیر تک اپنے گراں پایہ خیالات سے مستفید فرماتے رہے۔ آخر میں اپنا اخبار "مستقل" اور رسالہ "اردوئے معلّی" مرحمت فرمایا۔ اور اردوئے معلّی میں عنوان معائب سخن خصوصیت سے بتایا اور فرمایا کہ اس موضوع پر بڑی کاوش سے میں لکھ رہا ہوں اور آئندہ محاسن سخن کے موضوع پر لکھوں گا آپ ضرور پڑھیئے گا، قبلہ حسرت موہانی کی سیاسی خدمات کے مقابل ادبی خدمات بھی اس درجہ وسیع اور گراں پایہ ہیں کہ اُن کی تفصیل ایک مستقل تصنیف کی محتاج ہے۔ خصوصیت سے شعراء اردو یا تغزل میں اُن کا جو پایہ ہے اُس نے مستعد شعرا کو ایک جاں نواز سلیقہ سکھایا ہے۔ غزل گوئی کا بھر ممدوح کے اخلاق اور زندگی میں جو سادگی موجود ہے اُس کا تو جواب نہ ہوا ہے اور نہ ہو حسرت بھی علیگڈھ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ بی۔ اے پاس ہیں، لیڈر ہیں۔ اڈیٹر ہیں۔ مگر نہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں نہ کوٹھی میں رہتے ہیں نہ عام مسلمانوں سے تپاک سے پیش آنے میں نخرہ کرتے ہیں نہ گفتگو میں متکبرانہ اختصار حالانکہ ۹۵ فی صدی لیڈرس کا یہی حال ہے جن سے عام مسلمان مخاطب

ہونے سے ڈرتے ہیں۔ مگر ایک حسرت موہانی کہ نمونہ بنے ہوئے ہیں اسلامی خلق و مساوات کا۔ خدا زندہ رکھے!

یہاں سے اخبار صداقت کان پور کے دولت خانہ پر پہونچے۔ یہ اخبار کا دولت خانہ اس لیے کہ ابھی دفتر صداقت کی تعمیر جاری ہے حضرت خواجہ عبدالسلام ایڈیٹر ہیں اور یہ ایک ہفتہ وار اخبار ہے جو بہترین ترتیب سے شائع ہوتا ہے، اس کے ایڈیٹر ہمارے بھائی مولوی احسن سنبھلی رحمۃ اللہ کے صحیح معنیٰ کے قدردان ہیں اس لیے اپنے اخبار کی پیشانی پر مرحوم کا یہ بصیرت افروز مطلع ہر اشاعت میں لکھا جاتا ہے۔ ؎

جمالِ پرتو حق عزم مستقل میں رہے
زباں پہ بھی وہی ہو جو تیرے دل میں رہے

خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی بیحد مسرت کا اظہار فرمایا۔ صداقت کے ایک چھوڑ دو پرچے عطا فرمائے ان پرچوں میں حضرت ثاقب کی ایک معرکۃ الآرا غزل "آغوش آمنہ میں" شائع ہوئی تھی اور حضرت فرحت بی اے کی ایک نظم تھی جو ادیب محترم حضرت احسن سنبھلی رحمۃ اللہ کی جدائی پر لکھی گئی تھی۔ احسن کو اس طرح زندہ رکھنے پر خواجہ

عبدالسلام اور حضرت فرحت بی۔ اے، کی جو عزت ہمارے دل
میں پیدا ہوئی اُسے اس ناقدردانی اور بے مروتی کے دور میں
بھول نہیں سکتے یہاں سے حضرت ثاقب نے اپنی علمی و ادبی خدمات
کے مرکز یعنی اسلامیہ کتب خانۂ عامہ کا رُخ کیا جو ممدوح محترم کی
شبانہ روز کوششوں کا نتیجہ اور آپ کے ہمدرد معاونت کی جدو
جہد کا ایک سبق آموز نمونہ ہے جن لوگوں نے کانپور میں ہندو
بھائیوں کی لائبریری اور کتب خانوں کو دیکھا ہے وہ اس بے
بضاعت سے اسلامی کتب خانے کو دیکھکر جس درجہ دل گرفتہ ہو جگے
اس کا اندازہ مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہ کتب خانہ کانپور کے
چوک میں ایک شاندار عمارت میں واقع ہے بے شمار اخبارات
اور رسالے موجود ہیں اور ساتھ ہی متعدد و مختلف علوم کی بے شمار
کتابوں کی الماریاں بھی ہیں جو روزانہ مسلمانوں کے لیے مفت پیش
کی جاتی ہیں۔ اکابرین ملک نے اس کے متعلق بہترین رائے کا اظہار
فرمایا ہے مگر باوصف اس کے سارے کانپور میں مسلمانوں کی اس واحد
اسلامی اور قومی لائبریری کا حال یہ ہے کہ آمدنی للغہ بیس روپیہ ماہوار
اور خرچ ایک صد روپیہ نقد اسلامی اخبارات کی یہ بے حسیتی کس
درجہ تکلیف دہ ہے کہ وہ اپنے پرچے اس کتب خانے کو مفت

جاری نہیں کرتے اور مالی سرپرستی کے لیے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کان پور میں کبھی مالدار اور غیور مسلمان اس طرف سے ہو کر بھی نہیں گزرے ورنہ اُس کی سرپرستی ضرور فرماتے۔

اخبار البریدکان پور کے دفتر میں پہونچے اور حضرت مولوی فضل حسین صاحب مراد آبادی سے ملاقات کیا ہوئی گویا دو حقیقی بھائی آپس میں ملے۔ اخبار البرید کان پور ہی ہے جس نے ملا رموزی کی ابتدائی مضمون نگاری کے لیے اپنے صفحات کو بڑی محنت سے وار رکھا۔ مولوی فضل حسین صاحب ایڈیٹر اخبار البرید کان پور ایک نہایت کہنہ مشق، اور فاضل ایڈیٹر ہیں اور ممدوح کے اس عزم مستقل کا تو جواب نہیں کہ باوصف ہزاروں مصائب و مشکلات کے آج پندرہ سال سے اخبار کو جاری کیے ہوئے ہیں اور صوبجات متحدہ کے مسلمانوں کی جو خدمات اخبار البرید نے انجام دی ہیں حق یہ ہے کہ اُن کا پایہ خاص اور امتیازی ہے۔ یہی وہ اخبار ہے جس کے مطالعہ سے اصولی اخبار بینی اور سنجیدہ رائے زنی کا سلیقہ ملتا ہے۔ مولوی صاحب ممدوح ہمارے بڑے قدردان ہیں اور بیحد بڑے شفیق بزرگ الحمدللہ کہ صاحب فراغ اور مقدرت ہیں، ملتے ہی فرمایا کہ گانوں پر چلیے شکار کے لیے اسی موقع پر حضرت ممدوح کے برادر عزیز مولوی آشفاق حسین مراد آبادی

ایڈیٹر اخبار رہنما مراد آباد تشریف لائے اور اس درجہ تپاک سے ملے کہ تمام بی اے پاس مسلمانوں کے ملنے سے نفرت ہو گئی۔

اماں واقعہ تو یہ ہے کہ خلوص و ہمدردی اور اخلاق و تواضع تو کچھ وہی جانتے ہیں جو علی گڈھ سے بچ گئے ہیں اور جنہیں اخبار یا نیبر پڑھنا نہیں آتا۔

تو یہ ہے کان پور کی علمی و ادبی اور اخباری دنیا۔ ان پرچوں کے سوا یہاں سے اخبار "نظام عالم" اور صدائے مسلم، سفیر ہند اور شحنۂ شریعت بھی جاری ہیں جو عدیم الفرصتی کی وجہ سے معائنہ سے رہ گئے اب سچ تو یہ ہے کہ کان پور کے اخبارات جس پست اور ادنیٰ حیثیت سے جاری ہیں اُس سے یا تو اصولی اور باوقار اخبار نویسی بدنام ہوتی ہے یا مسلمانوں کا علمی اور اخباری ذوق ذلیل نظر آتا ہے۔ خدا جانے اِن اخباروں کے جاری کرنے والوں کو کونسا مرض ستاتا ہے کہ یہ ایسے پست اور ادنیٰ اخبار جاری کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کاغذ دیکھیئے تو لکھنوی کنکوے یاد آجائیں، سائز دیکھیئے تو پنساری کی ٹریاں یاد آجائیں۔ لکھائی چھپائی دیکھیئے تو دنگل کے اشتہارات یاد آجائیں مضامین دیکھیئے تو قصۂ حاتم طائی اور اندر سبھا امانت سے زیادہ وزن نہیں۔ پھر بھی انہیں اخبار کہہ کر عوام کی بد مذاقی اور

ناقدرشناسی کا رونا روئے چلے جا رہے ہیں ایسے اخباروں کے ایڈیٹر صاحب ہونے سے یہ بہتر ہے کہ ملک اور قوم کی اصلاح پر کوئی مستقل مگر بے حد دقیق کتاب لکھدیا کریں تاکہ مطبوعات اردو ہی میں تصنیفی اضافہ ہوتا رہے۔

اخباروں کے بعد اگر عوام کان پور کے علمی و ادبی ذوق کا آخری اندازہ درکار ہو تو معلوم کیجیے کہ کان پور میں ایک بھی ادبی انجمن نہیں۔ نہ یہاں مسلمانوں کے دارالمطالعے ہیں نہ ادبی انجمنیں، جس شہر میں متمول اور امیر قسم کے مسلمانوں کی آبادی دوسری قوموں سے کہیں سوا ہو وہاں علم و ادب کی یہ بے اعتنائی، اُن کی یوروپ زدہ ذہنیت اور غلامی فطرتِ ذوق کو اس لیئے ثابت کرتی ہے کہ اُن کی تجارتی دنیا میں انگریزی زبان کا چلن خاصا ہے۔ آپ کان پور کی جس دکان پر چاہیں دیکھ لیں اُس کے نام کا تختہ انگریزی زبان میں یوں لکھا ہوگا گویا لارڈ اروِن وائسرائے ہند ہی تو ان کی دوکان سے سودا سلف لینے آیا کرتے ہیں اور ان کی سہولت کے لیئے کان پور کے تمام ہی سوداگروں نے اپنی دوکانوں پر انگریزی زبان کے تختے لگا رکھے ہیں تو کیا بُرا کیا؟ وہ تو اچھا ہوا کہ یہ اورنگ آباد کی انجمن ترقی اردو

والے مولوی عبدالحق کبھی کان پور نہ آئے ورنہ وہ یہاں سوداگروں کے
ہاتھ اپنی ملکی اور مادری زبان اردو کی یہ درگت اور انگریزی زبان کی اس
ترقی کو دیکھکر مارے تاؤ کے ان تختوں کو پولیس کے حوالے کر دیتے، اماں
غضب خدا کا یہ کانپوری سوداگروں نے اپنی دوکانوں کے خطوط تک
میں اپنا پتہ انگریزی زبان میں چھپوا رکھا ہے۔ حالانکہ اکثر ایسے ہیں
جنہیں عمر میں ایک آدھ دفعہ ہی کسی انگریزی کمپنی سے خط و کتابت
کی نوبت حاصل ہوئی ہوگی، مگر ان کالج زدہ بھائیوں کو کون سمجھائے
کہ اگر آپ لوگ زبان اردو ہی میں انگریزی کمپنی والوں سے خط و کتابت
کریں تو وہ آپ کو ضرور جواب دیں گے۔ اس لیے کہ انگریز ہر حال میں
اصول پسند ہوا کرتا ہے، تو یہ فائدہ ہوا زبان اردو کو ان ہائی اسکولوں
اور کالجوں سے، پھر یہ تمام پانیر زدہ ہندوستانی جھنجھلاتے ہیں حضرت
ملا رموزی صاحب پر کہ کیوں وہ ان کی یوروپ پسندی کے خلاف کچھ
لکھتے ہیں! اور دیکھ لینا کہ ہمارے اس مضمون کو پڑھ لینے کے بعد یوں
پھینک دیا جائے گا گویا اس میں کوئی کام کرنے کے قابل تو بات کہی
ہی نہیں گئی۔

بھائی بشیر کی کوٹھی کیا تھی ملا رموزی کے لیے تو جنت اس لیے

تھی کہ یہاں ننھے میاں کی والدہ کا کوئی خطرہ نہ تھا، برقی پنکھوں اور لچک پیدا

کرنے والی کرسیاں۔ مرغ کے کبابوں سے لیکر انگور اور چوڑی کا باجہ

تک موجود تھا، خدام اور موٹر کی موجودگی سے ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ

اگر ہندوستان کی جگہ یورپ کی قوموں کے لیے ایسے مضامین لکھتے تو

آج کو خود ملا رموزی صاحب کی ایک اوپر دس کوٹھیاں موجود ہوتیں۔

مگر بھائی بشیر کی اس راحت بخش کوٹھی میں بھی جب یہ خیال آتا تھا کہ ننھے

میاں اور اُن کی والدہ کے لیئے کانپور کے تحفے کہاں سے جائیں ۔ تو

معاملہ دگرگوں ہو جاتا تھا، اس کوٹھی کی سکون بخشیوں پر حضرت محترمہ

بیگم صاحبہ مدظلہا، حضرت برادر محترم بشیر صاحب اور برادر خورد حضرت

مولینا محمد اسمٰعیل صاحب کی تواضع اور حسن اخلاق ایک ایسی حیات آرا

دولت تھی جو مُلّا رموزی کو دنیا جہان سے بیگانہ بنائے ہوئے تھی۔ باوصف

علالت طبع ان دونوں عزیز از جان بھائیوں نے مُلّا رموزی کے ساتھ

جس خلوص اور حُسن کرم کو ہر لحظہ روا رکھا حق یہ ہے کہ اُس کا شکر ادا نہ کرنا

خالص جلاہا پن ہے بھائی بشیر سے لیکر خاندان کے جملہ ارکان خصوصاً

ممدوح کے برادرانِ گرامی نے مُلّا رموزی کی میزبانی میں جن پیار بھرے

جذبات کو خرچ کیا وہ لکھنؤ کے تعلقہ داروں اور حیدرآباد کے جاگیرداروں

کی دولت سے کہیں زیادہ ہیں کہ دولت بہر حال تھیٹر یا سینما میں نہیں تو

ننھے میاں کی والدہ کے زیور پر خرچ ہو جاتی مگر یہ جذبات ملا رموزی
کے دل ہیں یوں محفوظ رہیں گے کہ بس محفوظ رہیں گے اگر یہ دیکھیں کہ
بھائی بشیر ادب اردو کے مشاہیر کے بہترین فوٹو بھی کھچوا دیا کرتے
ہیں اور انہیں رخصت ہوتے وقت بطریق یادگار بہترین قلم بھی عطا
فرماتے ہیں تو خطرہ ہے کہ ہندوستان کے تمام اہلِ قلم حضرات انکی
کوٹھی پر ٹوٹ پڑیں گے اس لیے آپ بھی سمجھ لیجئے کہ وہ کچھ نہیں دیتے
اور بڑے بے مروّت ہیں۔ غرض اِن تمام حالات کے ساتھ اگر ننھے
میاں کی والدہ کے مہر وصول کرنے والے دعوی کا خطرہ نہ ہوتا تو شاید
ہم عمر بھر اس کوٹھی سے اس لیئے جدا نہ ہوتے کہ ایسی ہی فراغتیں تو درکار
ہیں بیچارے مُلّا رموزی کو دُعا ہے کہ خدا بھائی بشیر کے دونوں بھائیوں
کو صحتِ عاجل عطا فرمائے، اِن تمام بھائیوں کے بھی شکر گذار ہیں جو
ہمیں نصف شب کو اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے۔ اور جن کے نام
افسوس کہ ہمیں یاد نہیں ڈاکٹر آرنسٹ صاحب حکیم اظہر حسین صاحب
بھائی بشیر صاحب نواب صاحب، اور عبدالجبار صاحب کے نام اسلیئے
نہیں لکھتے کہ دوسرے بھائی ناراض ہوں گے کہ ہمارے نام نہیں لکھے؟
بھائی بشیر صاحب کے کارخانہ شکر سازی میں یہاں کے مخلص بھائیوں
نے ہمیں جس خلوص اور پیار سے چائے کی دعوت دی اور جس کثرت سے اس میں

مٹھائی اور فواکہ فراہم کئے اور جس لطف سے ہمیں سنا رُسنایا، اُس کیلیئے آخر میں سراپا سپاس ودعا اس لیے ہیں کہ یہ قصہ ہمیں بعد میں یاد آیا، پھر بھی اتنا کہے دیتے ہیں کہ اِس کارخانہ سے جو مسلمان شکر خریدیگا اُسے جنت میں ایک محل موتیوں کا بنا ہوا اس لیے ملیگا کہ اس کی آمدنی سے مسلمانوں کے بچّوں کی امداد کی جاتی ہے۔ تبلیجیئے وہ فرما رہی ہیں کہ نماز بھی پڑھو گے یا نہیں۔ حالانکہ خود نماز کے ارکان تک سیکھ کر نہیں آئی رہیں۔ نماز کی عادت کا تو ذکر ہی کیا۔ تو ایسی ہوا کرتی ہیں ملا رموزیوں کی بیویاں !

طالب علم

طالب علم اصل میں نام ہے اُس بدنصیب، ستم زدہ، اور مظلوم
انسان زادے کا جو اپنی ماں کی جبات پرور گود سے لیکر اسکول اور
اُستاد کی بے رحم توجہ پر چھوڑ دیا جائے۔ گو اسکول کے بعد اُس کا نام
ڈپٹی کلکٹر اور گورنر جنرل یہ اجلاس کونسل تک ہو جاتا ہے مگر اُس وقت
کہ وہ دنیا کی بہترین اور مرغوب خواہشوں کو یوں ترک کر دے جیسے
اپنے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے مُریدوں نے تھیٹر کا تماشہ
دیکھنا ترک کر رکھا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ طالب علم دو چار کتابیں پڑھ کر اپنے
خاندان کا چراغ مانا جاتا تھا اور اُسے ہاتھی پر بٹھا کر تمام چوک میں
گشت دیتے تھے اور پلاؤ پکاتے تھے۔

طالب العلم کی دوسری تعریف یہ ہے کہ وہ طالب علمی کے بعد دُنیا
جہان کی امارت، ریاست، حکومت اور عزت و احترام کا مستحق

ہوتا ہے اور دنیا کی ساری منزلیں اُسی کے لیے ختم ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ خود کو کامیاب بنائے۔

طالب علم کی تیسری تعریف یہ ہے کہ وہ خاندان، قوم، ملک اور انسانوں کی بزرگی، آزادی، رہنمائی اور نجات کا سبب ہوتا ہے اس سبب سے کہ وہ اپنے عہد طالبعلمی کو کامیابی اور ثبات قدم کے ساتھ گزار دے۔

طالب علم کی چوتھی تعریف یہ ہے کہ وہ خود کو صبر و استقامت، علم و جفاکشی، ایثار و محنت اور جد و جہد کے حوصلہ آزما مصائب سے آسانی کے ساتھ گزار دے۔

پس اِن حالات کے ساتھ آپ ہندوستان میں غور کیجیے کہ طلبہ کتنے ہیں اور غیر طلبہ کتنے؟ ہمارے خیال میں طلبہ کی جو قسمیں کہ ملک ہندوستان میں نظر آتی ہیں، اُن میں

قسم اول کا طالب علم وہ چھوٹا سا آدمی ہوتا ہے جس کے گلے میں کتابوں کا بستہ اُلجھا دیا جاتا ہے اور گھر پر "حافظ جی" آکر اُسے پڑھاتے ہیں، ایسے ننھے منے طلبہ خواہ گھر پر پڑھیں خواہ حافظ جی کے مکتب میں جائیں۔ روتے ضرور ہیں۔ جہاں پڑھنے کا وقت آیا اور اُنھوں نے رونا شروع کیا اور یہ روئے وہ روئے بس اب روئے

اور دیکھنا کہ وہ روتے ہیں اور یہ نتیجے یہ روپڑے نا آخر کار اور پھر بھی نہیں کہ فقط رونے لگے بلکہ وہ مکتب جانے سے پہلے والد صاحب اور اماں بی سے ایک عظیم الشان دنگل بھی لڑتے ہیں اور پھر بھی بغیر قینچی اور چانٹوں کے مکتب نہیں جاتے اور لڈو کے لیے بیشمار پیسے وصول کئے بغیر تو دم نہیں لیتے، ایسے طالب علم کے سامنے تعلیم کا کوئی مقصد نہیں ہوتا ہے صرف مصیبت سمجھکر پڑھتا ہے۔ وہ مکتب میں پہنچکر بھی رونا، اور بات بات پر ناک صاف کرنے چھوٹا استنجا اور بڑا استنجا کرنے مکتب سے باہر جاکر یوں کھڑا رہتا ہے کہ جب تک حافظ جی کا دوسرا لڑکا اُسے پکڑنے نہ جائے وہ مکتب میں واپس نہیں آتا اور واپس آبھی گیا تو پڑھنے کی جگہ یا شرارت کرتا ہے یا روتا ہے سبق پڑھتے وقت یہ طالب علم حافظ جی کے نظر میں صدقے کا بکرا ہوتا ہے حافظ جی جتنا چاہتے ہیں اسے پیٹ لیتے ہیں، اور کبھی کبھی اوندھا بھی لٹکا دیتے ہیں، ایسے طلبہ مکتب جاتے ہوئے راستہ کی کسی تنگ و تاریک گلی میں ٹھہر جاتے ہیں۔ گولیاں۔ گلی ڈنڈا یا کوئی اور کھیل یوں کھیلتے رہتے ہیں کہ مکتب کا پورا وقت اس کھیل کے نذر ہو جاتا ہے اور یہ سیدھے اپنے گھر جاکر کہدیتے چھٹی ہو گئی یعنی پڑھ تو آئے۔

ان میں سے بعض ہوتے ہیں جو مکتب کا وقت باغات،

تماشہ گاہوں، نہروں، تالاب، اور کنوئیں پر بھی گذار دیتے ہیں لیکن حافظ جی کے ہاتھ نہیں آتے۔ اور انہیں میں کے بعض ہوتے ہیں جو دراجوان ہوکر بجائے بی اے پاس ہوتے کے یا پہلوان ہو جاتے ہیں یا غنڈے یا کسی تھیٹر کمپنی کے ایکٹر۔

قسم دوم کا طالب علم وہ ہوتا ہے جو اپنے باوا کے ڈپٹی کلکٹر ہونے کی وجہ سے گھر پر ماسٹر کو ملازم رکھکر پڑھتا ہے اور اس زمانہ کا ماسٹر تنخواہ پانے کی وجہ سے اُلٹا شاگرد کو اپنا اُستاد سمجھتا ہے۔ یہ ماسٹر تو پابندی سے حاضر ہوتا ہے مگر طالب علم غیر حاضر۔ ایسے طالب علم کو بیدرنجی، دھول، ڈانٹ اور چانٹا مارنے کی سخت ممانعت ہے اسی لیے آج کل کے اوستاد اور شاگرد ایک طرح کے "یار غار" ہو گئے ہیں۔ بعض ایسے ہی ماسٹر اس عمر کے طالب علم کو اپنے ساتھ تھیٹر کا تماشہ بھی دکھانے لے جاتے ہیں۔ اور بے وقوف ماں باپ کو اطمینان رہتا ہے کہ بچہ ماسٹر صاحب کے ساتھ ہی تو تماشہ دیکھنے گیا ہے۔ اس قسم کا طالب علم اُسی وقت سے بڑی اور سگریٹ پینا شروع کر دیتا ہے۔ جیب میں ہر وقت سات نمبر بیڑی یا قینچی چھاپ سگریٹ موجود رہتا ہے یا موجود رہتی ہے ان سیگریٹوں کا صرف اکثر ماسٹر صاحب بصیغۂ راز برداشت کرتے ہیں کیونکہ محنتی طالب علم سے آج کل کے ماسٹروں کو محبت ہوتی

جاتی ہے یا پھر یہ مصارف محلے کے غنڈے برداشت کرتے ہیں۔
اور ماں باپ ان حالات سے بے خبر رہتے ہیں اور کبھی خبردار بھی ہو
جاتے ہیں تو ازراہ بے شرمی ان حالات کی روک تھام نہیں کرتے
ایسا طالب علم تعلیم سے بیزار اور مذاق و تفریح کا بے حد شایق ہوتا
ہے ایسا طالب علم اکثر امیر خاندان کا ہوتا ہے اس لیے اُسے لباس
بہت خاصہ فیشن ایبل ملتا ہے صرف خرچ سے تنگ رکھا جاتا ہے
تو وہ بھی اس طرح خرچ حاصل کر لیتا ہے جس طرح اوپر بیان کیا گیا۔ مگر والد
صاحب اور بھائی صاحب اسی خیال میں مست رہتے ہیں کہ ہمارا
بچہ بڑا صابر اور جفاکش ہے۔

قسم سوم کا طالب وہ ہوتا ہے جو کسی نہ کسی طرح گلستاں بوستاں
تک پڑھ پڑھا کر ملازمت تلاش کرتا ہے یا گھر کا افلاس
اور ماں باپ کی جہالت اُسے تعلیم میں آگے نہیں بڑھنے دیتی اور
ایسے طلبہ کی تعداد ہندوستان میں زیادہ ہے مگر اسی قسم کے طلبہ
میں سے بعض ہوتے ہیں جو اپنی خداداد ذہانت۔ جفاکشی۔ فطری
صلاحیت اور قدرتی استعداد سے دنیا میں شبلی۔ سرسید اور ملا رموز بھی
ایسے مشاہیر اور نامور لیڈر بن جاتے ہیں اور جن کی ذہنی تربیت
محض فطرت کی غیر نمایاں قوت کرتی ہے۔ لیکن اسی قسم کا انگریزی طالبعلم

بہت وسیع قسم کا طالب علم ہوتا ہے اس وقت وہ پندرہ بیس سال کا ہوتا ہے یہ تعلیم کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا صرف اپنے چہرے اور بدن کی خوبصورتی بڑھانے کی فکر میں ڈوبا رہتا ہے اور اسی وجہ سے کبھی کبھی وہ امتحان میں پاس بھی کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ بعض ماسٹروں کے خیال میں تعلیم سے زیادہ مفید فیشن ایبل ضرورت بھی ہے۔ ایسا طالب علم غریبوں کا نہیں۔ بلکہ افسروں کا بیٹا ہوتا ہے۔ جیسے ہاکی۔ ٹینس۔ کرکٹ اور سینما کا شوق حد سے سوا ہوتا ہے۔ لباس اور جسم کے اندر جس قدر رنگینیاں دنیا میں ہو سکتی ہیں وہ جمع کرتا ہے خصوصاً سر کے بالوں کی آرائش پر اس کے بیشمار رسالے صرف ہوتے ہیں اور ہاکی کے میچ کے دن تو وہ نزاکت، ملاحت، اور صباحت کی "باد بہاری" بنکر فیلڈ پر جاتا ہے۔ اور اسی لیے بے شمار تماشائی کھیل کی جگہ اُسے دیکھا کرتے ہیں۔ ایسا طالب علم ہر سال فیل ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ اور اُس کا ساتھی اسکول سے خارج بھی کر دیا جاتا ہے اور پھر کسی دوسرے اسکول میں داخل ہی نہیں ہو سکتا؛ ایسا طالب علم اکثر رات کے وقت بھی چوری سے گھر سے نکل آتا ہے اور تھیٹر یا سینما چلا جاتا ہے ایسے طالب علم کی سرپرستی کے لیے آج کل ہر شخص تیار رہتا ہے اور طالب سے ہمدردی کرنا

ویسے بھی نہایت محمود شغل ہے، اس طالب علم کا زیادہ وقت دوستانہ خطوط لکھنے میں صرف ہوتا ہے۔ یہ خط میں اپنے نام کے ساتھ بجائے مخلص یا کمترین کے ہمیشہ آپ کا فلاں لکھتا ہے۔ اس کے والد ماجد کی طرف سے اس کی نگرانی کی اہم ذمہ داری اسی کا خدمت گار کرتا ہے۔ یہی خدمت گار اسے اسکول چھوڑنے جاتا ہے اور یہی اسکول سے لینے جاتا ہے اور بادا صاحب بڑے مطمئن رہتے ہیں کہ نوکر تو ساتھ ہے! مگر یہی خدمت گار ہوتا ہے جو اس طالب علم کی بیڑی اور سگریٹ کا انتظام کرتا ہے۔ گھر پر اس طالب علم کا زیادہ وقت اسی خدمتگار کی کوٹھری یا کمرے میں گزرتا ہے اور وہ ہر بات میں اپنے خدمتگار کا محتاج ہوتا ہے اور یہی خدمتگار اس طالب علم کے راز کے خطوط اپنی صندوق میں رکھتا ہے اور والد صاحب کے پاس طالب علم کی ہر ضرورت کو یہی خدمت گار پہونچا کر طے کرتا ہے۔ کبھی کبھی یہی خدمتگار سینما اور تھیٹر کی اجازت بھی دلا دیتا ہے، بعض رشوت خوار خدمت گار اس طالب علم کی ملاقات کسی اور سے بھی کرا دیتے ہیں۔ ایسے خدمت گار اس کے لئے شب کے بارہ تیرہ بجے تک دروازہ کھلا رہنے دیتے ہیں اور والد صاحب یہی سمجھے رہتے ہیں کہ "طولعہ" اپنے ہی کمرہ میں سو رہے ہیں! پھر ان حالات و اطوار کا طالب علم

اگر کہیں کا افسر ہو جاتا ہے تو اس سے ظلم وستم بے حجابی بے شرمی اور بے مروتی کا ہر فعل سرزد ہوتا ہے اور وہ نہیں شرماتا، ایسے طلبہ بحساب ۹۵ فی صدی فیل ہوتے ہیں۔

قسم چہارم

کا طالب العلم مذکورہ طالب علم سے صرف ذرا اونچا ہوتا ہے حالات اور اطوار تو وہی صرف عمر میں قدرے اضافہ کے باعث معاملات اور واقعات میں تھوڑی سی سنجیدگی اور بردباری پیدا ہو جاتی ہے علمی حیثیت سے یہ طالب علم آنکھوں کے چشمے اور پابند اخبار کے مطالعے تک ترقی کر جاتا ہے اس کا پہلا کام اپنے ماں باپ کی اصلاح اور مشاہیر عالم پر اعتراضات ہوتا ہے یہ دنیا میں کسی بڑے سے بڑے ماہر فن کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ مگر اس مصلحانہ حیثیت میں بھی خرچ حاصل کرنے کے لیے کسی غنڈے سے تعلق ضرور ہوتا ہے اور طالب کا یہی وہ پہلا زینہ ہے جہاں سے طالب علم سائیکل پر سوار ہوتا ہے اور بغیر سائیکل کے وہ اسکول یا کالج نہیں جا سکتا۔ ایسا طالب علم شام کے وقت تفریح گاہوں میں یوں ٹہلتا نظر آتا ہے گویا دنیا جہان کی اصلاح کے لیے افلاطون ایک مرتبہ پھر اپنی قبر سے نکل رہا ہے اور جو ایسا طالب علم اخبار زمیندار یا رسالہ سفینہ کی

اردو زبان کے چند الفاظ سیکھ لے تب تو اپنے مولانا محمدؐ علی اور شوکت علی اور پنڈت موتی لال نہرو کی بھی اُس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں - انہیں میں سے بعض ہوتے ہیں جو کسی اخبار کے ایڈیٹر بھی ہو جاتے ہیں اور ایسے ہی ایڈیٹروں کی وجہ سے موجودہ صحافت اردو میں پختگی، متانت، اور اصابت رائے اور مصلحانہ تدبیر و خطاب کی جگہ۔ گالیاں اور بازاری پن زیادہ نظر آتا ہے۔ یا پھر اس قسم کا طالب علم عاق عرب میں برطانیہ کا ہیڈ کلرک ہو جاتا ہے۔ اور بس مذہب اور احکام مذہب سے جنازہ کی نماز تک سے واقف نہیں ہوتا اسی لیے اس کے مزاج میں غیرت اور خودداری کا کوئی ادنیٰ جذبہ بھی نہیں ہوتا۔ شکسپیر، ملٹن اور ابوالکلام آزاد کے پچاس ساٹھ جملوں کو رٹ لیتا ہے اور شام کے وقت کسی کمپنی باغ میں بیٹھکر دنیا جہان پر تنقید کرتا رہتا ہے اس کے ساتھ کے کم فہم طلبہ پر اس کی تقریر کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے مگر ملا رموزی صاحب ایسے طالب کو لونڈے سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ ایسا طالب علم در پردہ اپنے خدمتگار یا غنڈوں کا فرصندار رہتا ہے، ایسا طالب علم بھی سر کے بالوں کو بہت محنت سے آراستہ رکھتا ہے اور سفر کے وقت انگریزوں کی ٹوپی ضرور لگاتا ہے اس سے بڑے مولوی صاحب بہت نفرت کرتے ہیں اور اُس کے "مقدمہ" میں گواہی دینے

سے شرماتے ہیں۔ ایسے طلبہ ہیں بے غیرتی، بے شرمی اور بے حیائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور ایسے ہی طلبہ سے موجودہ نسل اور نوجوان جماعت ذلیل ہو رہی ہے۔

قسم پنجم اس طالب علم کا صحیح معیار قائم کرنا بہت مشکل ہی کیونکہ از روئے طب یونانی اس عمر کا طالب علم عمل کے قابل ہوتا ہے تعلیم کے قابل نہیں۔ مگر

ہندوستان ہیں اس عمر کا طالب علم بی، اے میں پڑھتا ہے اور اسی لیئے کہا جاتا ہے اور والد ماجد کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ۔

"آپ کا غلام آج کل بی، اے ہیں پڑھ رہا ہے، کامیابی کی دُعا کیجیئے کہ خدا پاس کردے"

گویا۔ بی، اے کی تعلیم ہیں بھی (نعوذ باللہ) خدا اور رسول کی خوشنودی ہے جو خدا اسے دعا کرائی جاتی ہے، غرض بی، اے کے طالب کا ۹۵ فیصدی مقصد ملازمت ہوتا ہے۔ مگر بی۔ اے قسم کے طلبہ کی چند اقسام ہیں، ان میں سے پہلی قسم کا طالب علم وہ ہوتا ہے جو لندن سے بی۔ اے پاس کر کے آئے یا وہیں کسی میم کے ساتھ رہ جائے جس وقت یہ لندن سے بی اے پاس کر کے ہندوستان آتا ہے تو اُس کے خیالات ذیل کی چیزوں ہیں بند ہوتے ہیں۔

نے پردگی - لاطینی حروف میں اردو لکھنا- کرکیٹ ٹینیس اخبار میں اخبار پانیر اخبار- لباس میں لباس انگریزی لباس - موچھوں میں منہ پچھیں صفاچٹ موچھیں- ماں باپ سے نفرت کتے سے محبت ایسا طالب علم اگر کسی جگہ افسر ہوجائے تو یہ تمام ماتحت ہم وطنوں کو بجائے زبان کے اجلاس پر گھنٹی سے بلاتا ہے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں تمام اصول یورپ کے استعمال کرتا ہے اسی لیئے پچاس سال کے اندر اندر مرجاتا ہے اور جنازے میں صرف ماتحت لوگ شریک ہوتے ہیں اور محلے والے (الحمد للہ) کہکر چپ ہو جاتے ہیں-

افغانی طالب علم اس قسم کے طالب علم کی تعریف کرتے وقت خواہ مخواہ منطق سے بحث کرنا پڑتا ہے مثلاً جس انسان کے جسم پر دس بارہ تھان کپڑا لپٹا ہو وہ افغانی طالب علم کہا جا سکتا ہے یا جو انسان دس بارہ کپڑوں میں خود لپٹ جائے اُسے افغانی طالب علم کہہ سکتے ہیں- مگر ہمارے نزدیک اصلی افغانی طالب علم وہ ہی جو افغانستان سے سیدھا کسی پُرانے عربی کے مدرسہ میں جا کر داخل ہو جائے اور ہندوستان کے بے شمار اسکولوں اور کالجوں کو دھیان میں بھی نہ لائے اس طالب علم کی ذہنی صلاحیت، بیداری اور روشن خیالی کا اندازہ کرنا ہو تو بچہ سقہ کے حامیوں کو دیکھ لو، اس کی طالب علمانہ جدوجہد کے لوازم یہ ہیں- مفید

کھدر کی چادر، جامع مسجد کی سیڑھیاں، مسجد کا حجرہ، محلّے کی روٹی، جمعرات کی دعوت۔ جمعہ کا غسل، ساری رات کا مطالعہ اور جنازہ کی امامت، شام کے وقت یہ کسی کمپنی باغ میں لیٹا ہوا نظر آتا ہے، اسے ہائی سکولوں کے طلبہ کو گھورنے کا شوق بے حد و بے پایاں ہوتا ہے، اس کی اردو زبان حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے مطب میں بھی درست نہیں ہوتی، اور یہ بسند یکسر جا کے اس طرف چلا جاتا ہے پھر معلوم نہیں وہاں کیا کرتا ہے ہمارے خیال میں امان اللہ خاں کی مخالفت ہی کرتا ہوگا؟ ۔ ان میں کا ایک طبقہ خمیرہ گاؤ زباں، عناب، سپستان اور شربت بنفشہ کی تعلیم پاتا ہے اور اسی لیے اسے افغانستان میں بھی کانگریس اور لیگ بنانے کی فرصت نہیں ہوتی، البتہ کچھ دن سے چند افغانی طلبہ اسلامیہ کالجوں میں بھی داخل ہوئے ہیں اور انھی میں کے ہو سکتے ہیں جو تعلیم کے مقصد کو سمجھ کر تعلیم پا ئیں باقی رہے وہ افغانی طلبہ جو جدید تعلیم سے مزین ہو کر نکلے ہیں تو ان کے لیے افغانی شعور نے عمل کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں۔

خاص طالب علم

وہ ہوتا ہے جو انٹرنس پاس کر کے شادی بھی کر لیتا ہے اور ملازمت بھی مگر تعلیم حاصل کئے جاتا ہے اور باز نہیں آتا اس کا مقصد بھی علوم کا حصول نہیں بلکہ تنخواہ میں اضافہ ہوتا ہے اور ایسے طالب علم ابتدائی مدارس میں "ماسٹر صاحب" بن جاتے ہیں اور

بی۔اے کی تیاری میں مصروف رہتے ہیں، گھر کے افلاس اور اپنے ننھے میاں کی والدہ کی فضول خرچیوں سے تنگ آکر "ٹیوشن" بھی کرتے ہیں، عرف گھروں پر جاکر لڑکے پڑھاتے ہیں اور انہی کے گھروں پر جاکر پڑھانے نے ہندوستان میں اُستادوں کی عزت دو کوڑی کی کر دی ہے، پھر بھی ایسا طالب علم بڑھے جاتا ہے۔ سکول کے بعد اگر اس نے کبھی گھر میں کتاب کو ہاتھ لگایا تو اُس کے ننھے کی اماں نے کہا۔

پھر تم نے کتاب شروع کی؟

تو میں بیٹھی رہوں؟

تو تم ہی کہو گے کہ ترکاری بے مزا ہے!

ارے وہ نیل منگا رہی ہوں تیل۔

تو ننھے کو بھی لیتے جاؤ

وہ دیگچی پکانے نہیں دیتا اور تم کہتے ہو کہ میں ابھی آتا ہوں!

تو کیا میں اسے سکھا دیتی ہوں؟

اونہہ دیکھو تو وہ خود بخود تو تمہاری طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے!

کیا پہلے؟ پہلے پکالیتی تو وہ چاول پڑے رہ جاتے نا؟

اور خود کہ رہے تھے کہ اس وقت پڑھ رہا ہوں مجھ سے بات نہ کرو۔

سنو سنو۔

کیا خاک سنوں وہی تمہارے ملا رموزی صاحب آواز دے رہے ہیں

بس اب خدا حافظ ہے دیکھیں مُلّا رموزی صاحب سے اب تمہیں فرصت کب ملے،

اچھے مُلّا رموزی ہیں ایک گھڑی بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے!

تم کیا جانتی ہو مُلّا رموزی صاحب کو؟ بیچارے میرے حال پر کرم فرماتے ہیں جو چلے آتے ہیں ورنہ اُن کی تو صورت دیکھنے کو لوگ ترستے ہیں۔

ترستے ہوں گے۔؟

ہاں تم بیچاری گھر کی بیٹھنے والی کیا جانو ملا رموزی صاحب کو؟

بہت اچھا حاضر ہوا مُلّا صاحب،

بس ذرا ٹھریئے ابھی حاضر ہوا۔

ہاں تو ڈھائی آنے تک کی لوکی اور وہ سوا آنے کی کیا چیز منگا رہی ہو؟

تمہاری گڑبڑ میں میں بھی تو بھول گئی۔

وہ تو اب تمہارا دل لگا ہوا ہے مُلّا رموزی صاحب میں،

اچھا تو جانے دو مگر دیکھو وہ رحیمن کو میرے پاس بھیجتے جانا،

لاحول ولا میرے ساتھ ملا صاحب ہوں گے اور میں رحیمن کے

گھر بھی جاؤں گا۔

تو یہ میلی ٹوپی تو ننھے کو نہ پہناؤ

تو ذرا خود ہی دوسرے والان میں دیکھ لو۔

اچھا اچھا تم تو خدا کے لیے باہر جاؤ۔

اور سنو تو۔ ارے سنا،

میں نے کہا کہ کب تک آؤ گے؟۔

اچھا اچھا.......... بہت اچھا، بس آیا ملا صاحب

کیوں۔ نہیں.............. میں...... کروں گی۔

یہ چند نمونے ہیں ہندوستان کے طلبہ کے، صحیح نہیں۔ کہ تمام طلبہ ایسے ہی ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ کثرت ایسے ہی طلبہ کی ہے، پس اگر ایسے طلبہ دنیا کی کسی قوم کے لیئے باعث زوال و ذلت ہو سکتے ہیں تو آئے سب سے پہلے ہندوستانی طلبہ کی اخلاقی اصلاح کی تدابیر اختیار کیجیئے لیکن اس کے لئے کسی زبردست "کانفرنس"، یا کسی آل انڈیا کی ضرورت نہیں صرف سکول کے ماسٹروں اور کالج کے پروفیسروں کی اصلاح مقدم ہے۔ کیونکہ طلبہ میں "نسوانی" اور "یوروپی ذہنیت" پیدا کرنے والے بھی فیشن زدہ اور اپنی قومی عصبیت سے نے بہرہ ماسٹر اور پروفیسر ہیں، اور جب تک

ان لوگوں میں "خالص ہندوستانی قومیت" پیدا نہ ہوگی اُس وقت تک ہندوستان سے کوئی ایسی جماعت پیدا نہیں ہو سکتی جسے صحیح معنی میں تعلیم یافتہ جماعت کہا جائے اور یہ جو آج کل تعلیم یافتہ لوگ کہے جاتے ہیں۔ یہ تو ہیں فقط "انگریزی یافتہ" اور اس کا بہتر ثبوت ان کی اخلاقی ذلت ہے ورنہ تعلیم کبھی ایسے اخلاق کی محرک نہیں۔

آیندہ جو رائے عالی ہو بہ واپسی مطلع فرمائے، جواب کا انتظار رہیگا

تمام خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام۔

دست بدست

سو ہزار مصیبتوں کی ایک مصیبت غلامی، اور اس کے بعد غلامانہ ماحول کی تعلیم و تربیت ہوا کرتی ہے۔ مقہور و زوال یافتہ اقوام کی بیشمار علامتوں میں سے ایک علامت اُس کے افراد کی "ذہنی فضولی" نے اعتدالی، یا غیر ذمہ دارانہ اعمال ہیں اور اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کو زندگی کے جس حصہ میں چاہو دیکھو وہ موجود ملے گی۔

مذہب جو آج تک بہ اتفاقِ عام و خاص ایک برتر از قیاس و گمان احترام و تعمیل کی چیز مانا گیا ہے۔ مگر مسلمانانِ ہند اور ہندوؤں نے اس کی ذمہ داری کو مسجد کے سامنے باجے کی حرکت اور گائے بیل کی حفاظت تک محسوس کیا ہے۔ اور بس۔

تجارت میں اگر کوئی ذمہ داری محسوس کی گئی ہے تو صرف اس قدر کہ ملا رموزی صاحب کو ہر چار آنے کی چیز بارہ آنے میں فروخت کی جائے اور بس۔

تعلیم میں اگر ذمہ داری کا احساس ہے تو بوٹ سوٹ بورڈنگ میں نوجوانوں کا نسوانی بناؤ سنگھار یا پھر ہاکی۔ فٹ بال اور کرکٹ کی ٹورنامنٹ بازی" اور بس۔

سیاست میں نہرو رپورٹ کا جھگڑا، اسمبلی میں بم کے گولے گورنمنٹ کو سیدھی سیدھی کو وجہ شہرت و ترقی اور وائسرائے کے ساتھ چائے نوشی کا ذریعہ اول یا وفد کے ساتھ یوروپ گھوم آنے کا ذریعہ آخر قرار دینا اور بس

صحافت میں دوسرے تمام ایڈیٹرس کو گالیاں، اعلانات، پریس کے لیے چندہ کا اپیل، اور ہندو مسلم فسادات کے جذبات کی ترجمانی اور بس۔

شاعری میں از خود "شاعر اعظم" بن کر گوہر جان اور منی جان کے رنگ کی تصاویر پر نظمیں لکھنا۔ یا امیروں کے قصیدے لکھنا، اور جو زیادہ بڑھا تو دو چار اشعار میں "ہائے قوم اور وائے قوم" لکھ دینا اور بس۔

مضمون نگاری میں عشقیہ فسانے لکھنا اور تالیف و تصنیف میں فقط ملٹن اور ٹیگور کی غیر مانوس کتابوں کے ترجمہ لکھنا اور بس۔

پس یہ سب کچھ اثر ہے تعلیم و تربیت کے ہندوستانی ٹھیکیداروں کی۔ "نیم یوروپ زدہ ذہنیت اور صحبت کا" بھلا وہ ماسٹر اور پروفیسر ہندوستانیوں میں کیا خاک اصول ذہنیت اقومیت، اور ذمہ دارانہ

احساس کی صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں جو دوسری اقوام کے عادات وخصائل، اور اطوار و کردار کو اپنے قومی آداب واصول پر ترجیح دینے ہی کو اپنی قابلیت سمجھتے ہوں" اور جو اخبار زمیندار کے مقابل اخبار پانیر کو اور رسالہ رعالمگیر کے مقابل انگریزی ناولوں اور انگریزی رسالہ "ماڈرن ریویو" کو آنکھوں پر دھرتے ہیں" اماں اور تو اور یہ جب بچہ کو شروع ہی سے خود ماسٹر صاحب بھرے جلسہ میں سیٹی بجا کر ہاکی اور فٹ بال کھلاتے ہوں تو اُن کی تعلیمات وارشادات کا اس بچہ پر کیا خاک اثر ہو گا۔

پس ان حالات کے جو تباہ کن اثرات ہندوستانیوں کے ہر حصۂ زندگی پہ پڑ رہے ہیں۔ اُن میں ایک حصہ "بینی" بھی ہے۔ آپ بینی سے مراد ناک نہ لے لیں بلکہ یہ وہ بینی ہے جسے اخبار رسالے اور کتب خانے کے ساتھ ملا کر۔ اخبار بینی۔ رسالہ بینی، یا کتب بینی کہتے ہیں، اب اگر ہندوستانیوں کی اخبار بینی یا رسالہ بینی کی تفصیلات پر کچھ لکھا جائے تو وہی دس دہام بیس جلدیں تیار ہو جائیں گی اس لیے آپ آج فقط ان کی "رسالہ بینی" ملاحظہ فرمایئے تاکہ سند رہے۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم نے کوئی تین چوک بارہ مرتبہ لکھا ہے کہ ہم اخبارات اور رسائل کے آمد و خرچ کے حساب سے ایک طرح کا "صدر ڈاک خانہ" ہیں اللہ میاں کا فضل ہی کہئے کہ ہندوستان کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا اخبار اور رسالہ نہیں۔ جو "بخدمت شریف ملا رموزی صاحب" نہ آتا ہو اور اب جو کچھ دن سے یہ "بغرض اظہار رائے" کی ہوا چلی ہے تو اس نے تمام پرچوں کا رُخ ہماری طرف پھیر دیا ہے اور الحمدللہ کہ ایک ہفتہ کی ردی کے دام روپیہ سوا روپیہ ہوتے ہیں، ہم نے ان پرچوں کے محفوظ رکھنے کی کوشش کبھی جو نہ کی سو کسی تجارتی غرض سے نہیں بلکہ اس لیے کہ انسانی ارتقاء اور ترقی کے طبعی اثر سے ہمارے شہر میں بھی اخبار بینی اور رسالہ بینی کافی زور اختیار کر چکی ہے جس کی تفصیل ہی آج کا مضمون ہے یعنی شروع ماہ جون سنہ ۱۹۲۹ء میں رسالہ "عالمگیر" لاہور کا سالانہ نمبر آب و تاب سے شائع ہو گیا کہ اس طرح کہ دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک سب کے پاس یہ پہنچ گیا، اخباروں میں اس خاص نمبر کے اشتہارات شائع ہو گئے" اور "ریویو" بھی لکھ دیے گئے۔ ڈاک خانے والوں نے جس قدر پرچے چاہے چرا بھی لیے مگر یہ سالانہ نمبر آیا تو ہمارے پاس، اور ہمیں چونکہ "مضمون بازی" سے فرصت نہ ملی اس لیے ہم نے ایڈیٹر صاحب سالانہ نمبر کو بھی نہ لکھا کہ "بھیجدو" مگر چارپائی پہ لیٹے لیٹے بولیں

کہ کیوں جی یہ " عالمگیر" تمہارے پاس ابھی تک نہیں آیا؟ یہ " زمیندار"
میں تو لکھا ہے کہ عالمگیر چھپ گیا، اُن کے لفظ " کیوں جی" پر آگ
سی لگ گئی۔ اور ہم نے جھنجھلا کر ٹالنے کے لیے کہا۔ آجائیگا۔ تو پھر بولیں اور
کس قدر دبیل کے ساتھ بولیں کہ اور جو سب کا سب بک گیا تو؟ اس پر بھی
ہم نے چاہا کہ وہ کسی طرح خموش ہو جائیں کیونکہ اس وقت ہم تھے مصروف
لکھ پڑھ۔ مگر وہ چپ کیوں ہوتیں بولیں اور پھر دبیل کے ساتھ بولیں کہ
اس وقت لکھ بھی رہے ہو ایک کارڈ اسے بھی لکھ دو گے تو کیا برا ہے؟
ظاہر ہے کہ اب سلامتی اسی بات میں تھی کہ کارڈ لکھ دیتے، ادھر یہ بھی خیال
تھا کہ ابھی نام خدا اُن کا رسالوں سے شوق تازہ بتازہ ہے کہیں اسے
ٹھیس نہ لگ جائے ورنہ کو دن ہی رہ جائیں گی۔ لہذا اڈیٹر صاحب عالمگیر
کو فوراً لکھا کہ اب تک کیوں نہیں بھیجا۔ خیر تو اب بھیجدیجیے۔ " عالمگیر" کے دفتر
میں جہاں بھول جانے والے لوگ موجود ہیں وہاں یاد دہانی پر چندہ
بھیجدینے والے لوگ بھی جمع ہیں اس لیے کارڈ پہونچتے ہی عالمگیر کا
سالانہ نمبر ذریعۂ رجسٹری " اپنی پوری زیبائشوں کے ساتھ ذریعۂ رجسٹری
ہمیں عین دوپہر کے وقت یوں ملا کہ ڈاکئے صاحب نے کمرہ کے دروازہ پر
اپنی ڈاک کا تھیلا اس زور سے دے مارا کہ ہم دوپہر کی میٹھی نیند سے نیم بیدار
سے ہو گئے اور اب وہ چیخا کہ مولی ساب یہ رجسٹری لیتا! آنکھیں ملتے ہوئے

سینہ کھجاتے ہوئے، اور چکر کھاتے ہوئے دروازہ پر پہونچے تو دستخط کے لیے ڈاکیے نے پھر قلم لینے گھر میں واپس بھیجا۔ قلم لاکر دستخط کئے تو تاریخ لکھنے تک روشنائی ختم ہو گئی تو پھر روشنائی کے لیے میز کی دوات تک گئے اور پھر دروازہ پہ آکر تاریخ لکھی تب کہیں عالمگیر کا سالانہ نمبر ملا تو اب وہ میٹھی نیند غائب، شفا خانے کے مریضوں کی طرح پلنگ پر دوبارہ ہاتھ پاؤں مار کر نیند کو بلانا چاہا مگر وہ نہ آئی تو سالانہ نمبر کے اوراق کو الٹنا شروع کیا کہیں کہیں سے کچھ پڑھا بھی کہ نیند آگئی، اب کوئی شام کے پانچ بجے یا کوئی ساڑھے پانچ بجے اٹھے تو دیکھا کہ وہ بیٹھی عالمگیر کے تصویریں دیکھ رہی ہیں بس ان کے اس ذوق کو غنیمت سمجھ کر خود کو ان کی طرف سے یوں غافل بنا لیا گیا گویا ہم نے انہیں تو دیکھ لیا مگر یہ نہیں دیکھا کہ وہ "عالمگیر" کی تصویریں دیکھ رہی ہیں۔

٭٭٭

نماز عصر اور چائے سے فارغ ہو کر لکھنے پڑھنے والے کمرہ میں جاکر بیٹھے تو خود ہی عالمگیر لاکر سامنے پٹک دیا، اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ پیش تھا کہ عالمگیر کے اس نظر آرہا سالانہ نمبر پر کوئی رائے لکھیں۔؟ لیکن رائے لکھیں تو پہلے اس کے ۲۹۰ صفحات کی ایک ایک سطر پر انگلی رکھ کر اسے پڑھیں اور جو معاملہ صرف "سرسری" پر اٹھا رکھیں تو پھر ہم خود اس

غیر ذمہ داری کے مجرم قرار پائیں گے۔ جس پہ یہ مضمون لکھا جانے والا تھا اس لیئے سالانہ نمبر کی ایک ایک سطر پڑھنے کی ٹھانی ہی تھی کہ آواز آئی اور بس۔

"میں حاضر ہو سکتا ہوں؟"

"تشریف لایئے"

"السلام علیکم"

"مزاج اقدس"

"کہئے کیا ہو رہا ہے؟"

"اماں لاحول ولا یہ بھی کوئی مضمون نگاری کا وقت ہے۔؟"

"تم تو ہو گئے ہو پاگل"

"بھئی تو آخر یہ دن رات کی مضمون نگاری کچھ تمہیں خدا اسے بخشوا دے گی؟"

"کہاں؟ بس یہی عجائب خانے کے باغ تک"

"تو چلو پھر اُٹھو نا"

"یہ کیا؟ اچھا عالمگیر کا سالانہ نمبر ہے!"

"اچھا تو بھئی لاؤ اسے ذرا ہم لے جاتے ہیں"

"نہیں نہیں۔ واللہ کل واپس کر دیں گے"

"ہاں ہاں صبح ہی صبح"

یہ ہمارے ایک دوست تھے جو ابھی نئی روشنی میں آنکھیں کھول رہے ہیں اور ہم بھی چاہتے ہیں کہ یہ اتنے دلچسپ تو ہو جائیں کہ ان سے مل کر کبھی ہم خوش ہو لیا کریں۔ واضح ہو کہ ان کا دولت خانہ ہماری غریب خانے سے پورے تین میل دور ہے، عالمگیر، تو گیا اور ہم دوسرے مضامین میں مصروف ہو گئے کہ ایڈیٹر صاحب عالمگیر کا دوسرا خط آیا کہ۔ اور وہ مضمون؟ دوسرے دن مذکورۂ بالا دوست تشریف لائے تو ہم نے بغیر سلام ہی کے عرض کیا۔

اور وہ۔" عالمگیر"

" استغفر اللہ اماں وہ ایسا بھی کیا کوئی سونے کی چڑیا ہے جو خیریت نہ خیر و عافیت، عالمگیر، عالمگیر، ٹرا عالمگیر"!

" چلو چلو کل بھیجدوں گا وہ تو رات کو آدھے کے قریب دیکھ بھی لیا۔

اب دوسرے دن موصوف خود ہی غائب ہو گئے تو تنگ آکر تیسرے دن ہم خود اُن کے دولت خانے پر حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ حضرت گھر میں، تشریف نہیں رکھتے اس لئے آج کا ہمارا سفر اور وقت بیکار ہو گیا چوتھے دن ہم نے وقت کی پھر قربانی کی اور پہونچے تو موصوف ملے، بڑی خاطر سے کمرہ کے اندر بٹھایا، پان اور سگریٹ لائے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع

ہوئی تھیں کہ موصوف کے بڑے بھائی صاحب بھی تشریف لائے اور صورت دیکھتے ہی فرمایا۔

"اخاہ ملا رموزی صاحب ہیں۔"

بھئی واللہ تم تو عید کا چاند ہو گئے۔

"کہو اچھے تو ہو؟"

"اماں کہاں رہتے ہو۔؟"

"بھئی مجھے تو واللہ دفتر سے ایک منٹ کی فرصت نہیں اور پھر دفتر سے آنے کے بعد تو تم خود جانتے ہو کہ بازار تک جانا بھی قیامت ہو جاتا ہے۔"

"اچھا خیر آپ تو یہ کہو کہ وہ امان اللہ خاں کا کیا ہوا اماں یہ مردود بچہ سقہ بھی عجیب نکلا، میاں تم نے تو اخبار پڑھنے کی حد ہی کر دی ہے۔ مگر تم مانو یا نہ مانو ہمارا تجربہ بھی یہی ہے کہ یہ سب خبریں گپ ہیں یہ کمبخت اخبار والے پیسہ کمانے کے لیے ایسی ہی اڑایا کرتے ہیں۔"

قریب تھا کہ آپ سیاسیات کے ایسے ہی نادر فیصلے صادر فرماتے ہوئے مسٹر میکڈانلڈ کی وزارت اور جمعیۃ الاقوام کے وجود سے بھی انکار کر دیتے کہ ہم نے بات کاٹ کر چھوٹے بھائی سے کہا کہ

لایئے تو وہ عالمگیر، بڑا ضروری کام ہے اب جا رہے ہیں، "کہ

فوراً ہی سیاست داں بھائی بولے۔

بھئی ملا صاحب قصور معاف عالمگیر تو ابھی نہ دیں گے کیونکہ اُس میں ہیں بھئی قصے بہت عمدہ، اور ابھی میں نے یوں نہیں دیکھا کہ چھوٹے میاں ابھی اُسے دیکھ رہے تھے۔ بس پرسوں انشاء اللہ میں پہونچا دونگا یہاں سے عالمگیر، دست بدست کے رتبہ پہ پہونچا اور ہم واپس آگئے اب بڑے بھائی کی "پرسوں" بھی یوں پوری ہوئی کہ تیسرے دن ہم پھر خود ہی حاضر ہوئے تو چھوٹے بھائی عالمگیر لائے تو مگر اس طرح کہ بڑے انکسار سے فرمایا کہ ملّا صاحب اگر آپ اجازت دیں تو میں صفحہ اول کی تصویر لے لوں یہ مجھے بہت پسند ہے اور ویسے بھی آپ کو تو تصویر سے کوئی دلچسپی بھی نہیں! مشرقی دوستی کا تقاضا تھا کہ عرض کر دیں کہ تصویر حاضر ہے وہی ہوا کہ موصوف نے ہمارے ہی سامنے بغیر بسم اللہ اللہ اکبر" کہے تصویر کو عالمگیر سے یوں نوچ لیا کہ پورا صفحہ اول اُکھڑ گیا اور جلد کا تاگا ٹوٹ گیا، مگر اس نقصان پر بھی خوش تھے کہ، عالمگیر، مل تو گیا۔ گھر لا کر میز پر رکھا اور پڑھتے پڑھتے چھوڑ کر چلے گئے نوکری پر واپس آئے تو راستہ ہی سے ایک دوست ساتھ ہو لیے یہ کہہ کر کہ :-

اماں تم تو ملتے ہی نہیں، چلو آج تمہارے ہی گھر چائے پئیں گے۔"

ہم تو گئے انہیں بٹھا کر اندر اور انہوں نے اس عالمگیر پر قبضہ جما لیا

اندر سے جو ہم آئے تو دیکھا کہ عالمگیر کو یوں پڑھ رہے ہیں گویا وہ براہ

راست انہی کے پاس آیا ہے، کچھ بھی نہ کہا، چائے پلائی ایک گھنٹہ

تک گپ ہوتی رہی۔ اب جو رخصت ہونے لگے تو فرمایا۔

میں عالمگیر لے جاتا ہوں۔

تو ہم نے مسلسل تین چار قسمیں کھا کر عرض کیا کہ بڑی مشکل سے ابھی

آٹھ دن کے بعد ہمیں ملا ہے۔ اور یہ دیکھو اس کے ایڈیٹر کے خطوط پر خطوط

چلے آ رہے ہیں۔ ہمیں کل تک رائے دینے کا اور موقعہ دید و پھر تم اسے

ہمیشہ کے لیئے لیجانا ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ واضح ہو کہ یہ ہمارے ایک

ایسے دوست جن سے کوئی پانچ اوپر دس برس سے دوستی اور دشمنی

برابر سے چلی آ رہی ہے۔ دوستی کے ساتھ یہ دشمنی اس لیئے کہ وہ

بھی ہماری ایک طرح کے فوجداری کے وکیل ہیں اور کبھی استدلال

استشہاد۔ استناد۔ مذاکرے۔ مقابلے اور مباہلے تک سے نہیں

چوکتے۔ بس ہمارا اتنا عرض کرنا تھا کہ فوراً ہی تو اُتر آئے فوجداری

پر، نتیجہ یہ ہوا کہ عالمگیر پر قابض ہو گئے۔ پھر یہی نہیں کہ وہ عالمگیر ہی

لے گئے بلکہ ہمیں بھی اپنے ساتھ دھر لیا اور دو دن تک ہم آپ کی نشاعت

میں یوں گئے گویا، عالمگیر لے جانے پر بھی ہم ان سے بجد خوش تھے۔

جوان کے ہمراہ گپ فرماتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اب یہاں عالمگیر دست بدست کے دوسرے درجہ میں داخل ہو گیا۔ اور نہ فقط عالمگیر ہی گیا بلکہ وہ مضمون کا سارا وقت بھی غارت ہو گیا۔ بہ ثابت معتبر ذرائع سے بعد میں معلوم ہوا کہ ممدوح جو عالمگیر کو لیکر گئے تو راستہ ہی میں وہ اپنے ایک دوست کے ہاں بھی کچھ دیر ٹھہرے جس کو ان سے سب کچھ چھین لینے کے "ادبی حقوق" حاصل تھے لہٰذا دو دن تک عالمگیر اسی دوست کے گھر رہا اور تیسرے دن وہ ممدوح کے دولت خانے پر پہونچا تو ہم خود سمجھ گئے کہ اب دو دن تک ان سے طلب کرنا اپنی ہی حماقت تو ہو سکتی ہے ان کی نہیں لہٰذا پورے چار دن کے بعد خود ہی ان کے دولت خانے پر پہونچے اور عالمگیر کا تقاضا کیا تو فرمایا۔

استغفر اللہ عمر میں اگر آپ کا ایک رسالہ لے آیا تو قرض خواہ کی طرح سر پہ سوار ہو"

اور ہزار بار ایسا ہوا ہو گا کہ تم میری کتابیں لے گئے ہو گے مگر میں نے کبھی منہ سے ایک حرف بھی نہ کہا"۔

اس ہزار لے گئے ہو گے" کے فقرہ پر ویسے بھی از روئے ریاضی ہمیں کچھ کہنے کا حق باقی نہیں رہا تھا مگر کچھ جو کہدیا تو فرمایا اور

کس قدر معقول فرمایا کہ۔

"بہتر ہے تو کل وہ پرچہ آپ کو مل جائے گا

"آ کر لے جائیگا کیونکہ اس وقت تو اُس کا پتہ نہیں ہے یا شاید

وحید نے کہیں رکھ دیا ہوگا

خیر سے وحید صاحب کو بھی ایک چھوڑ دو ایسے صاحب زادے مل گئے ہیں جو ہم سے تو خاصے اکڑ لیتے ہیں مگر ہمارے مضمون والے پرچے کے مطالعہ سے کبھی چوکتے نہیں۔ اس لیے سمجھ لیا کہ بس گیا عالمگیر، مگر وہ تو کہیے کہ ہم ذرا عملی آدمی واقع ہوئے ہیں اس لیے پہونچ گئے پھر اُن کے گھر معلوم ہوا کہ ابھی باہر گئے ہیں۔ اور چونکہ ہندوستانی خاندانوں میں صرف ایک آدمی ہے تمام خاندان کا کفیل اور سرپرست ہوا کرتا ہے۔ لہذا حبیب کفیل ہی مگر یہ نہ ہو تو پھر ہمیں "عالمگیر" کون دے سکتا ہے۔ استغفراللہ وغیرہ پڑھتے ہوئے پھر واپس آ گئے اور پھر دوسرے دن پہونچے تو صورت دیکھتے ہی فرمایا اور کوتوالی کے لہجہ میں فرمایا کہ

"جی ہاں وہی عالمگیر کے لیے آیا ہوں۔

ہاں تو میں نے معلوم کر لیا وہ فلاں صاحب لے گئے ہیں کل

میں اُن سے منگا لوں گا اور آپ لیجائیے گا"

پھر بھی حاضری ہمارے ذمہ رکھی گئی موصوف کو چونکہ خدا نے لیڈری
کی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے اس لیے گھر پر قوم کا خاصہ مجمع رہتا ہے
اور وہ بھی رات میں اس لیے قہر درویش بر جانِ درویش ہو پہنچے.
جناب رات کے ۹ بجے مجلس کے ہر رکن کو ملا رموزی صاحب کے
آنے کی بیحد خوشی ہوئی اس لیے اس خوشی میں جب رات کے گیارہ
بجے تو ہم نے عالمگیر کا سوال پیش کیا تو چہ صاحب موصوف الصدر
دوست سے لے گئے تھے ایک جمائی ملی ہوئی انگڑائی لے کر بولے
ہاں ملا صاحب وہ آپ کا "عالمگیر" میں لے گیا ہوں کل انشاءاللہ
ضرور حاضر کر دوں گا "
یہاں تاب کسے تھی اس لیے ہم نے عرض کیا کہ اگر جناب اجازت
دیں تو ہم یہاں سے آپ ہی کے دولت خانے چلیں تو آپ ہمیں
پرچہ دیدیں، بیچ ہی سے بول اُٹھے۔
اماں پرچہ کیا ہو گیا ہے بلائے جاں ہو گئی، بھلا یہ بھی کوئی
پرچہ مانگنے کا وقت ہے؟ چلو تم تو یہ سنو۔
یہ صاحب کیا فرما رہے ہیں۔
دوسرے صاحب بولے۔ بس جناب جو ہیں دہلی کے اسٹیشن
پر اترا تو یہ ہوا اور وہ ہوا۔

ہم نے بھی یہ بے اصولی دیکھکر عالمگیر ہی کو لے لیا اور وہ تقاضے شروع کئے وہ تقاضے شروع کئے کہ تقریباً تمام محفل بول اُٹھی کہ اچھا تو آپ اسی وقت ان کے گھر سے جا کر پرچہ لے لو۔ اور بھئی دیکھو اب تو ملا صاحب سے پرچہ لائے ہو لیکن اگر ان کے پاس سرخاب کا پر بھی ہو تو نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔ بس بس مُلّا صاحب بس جائیے جائیے اور پرچہ لے لیجیے، یہ گویا پرچہ طلب کرنے پر محفل کے آوازے اور پھبتیاں تھیں جو ہم نے نیچی گردن کر کے سُن لیں مگر عالمگیر کے تقاضے سے چوکے نہیں تو بھائی صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے مگر یہ کہتے ہوئے کہ ملا صاحب آپ گھر تو چل رہے ہیں مگر اس وقت گھر میں سب سو گئے ہوں گے خدا ہی ہے جو عالمگیر اس وقت مل سکے کیونکہ وہ لونڈے نے مجھ سے لے لیا تھا اور اب وہ پڑا سو رہا ہو گا۔ اور سو رہی ہوں گی، تو پھر صبح پر نہ رکھئے؟ تو ہم نے بھی کہہ دیا جی نہیں۔ اسی وقت۔ اسی منٹ اور اسی سیکنڈ ہی پر رکھئے، تو قدرے تاؤ کے ساتھ بھائی صاحب ہمراہ ہو لیئے اور ہم گرہ سے "شب تاب" عرف "سرچ لائٹ" خرچ کرتے ہوئے بھائی صاحب کی گندی اور بدبودار گلیوں میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے کوئی تہجد کی نماز سے دو گھنٹہ پہلے پہونچے۔ راستہ میں جو بے تکی باتیں ہوتی جاتی تھیں

اس میں کبھی کبھی پولیس والوں کی "گون" بری طرح حائل تھی مگر وہ تو کہئے کہ ہمارے پاس شب تاب تھی اس لیے کوتوالی جانے سے محفوظ رہے ورنہ عالمگیر کے صدقہ میں یہ بھی ہو رہنا تو مضائقہ ہی کونسا تھا کیونکہ دوستوں کی بے اصولی اور غیر ذمہ داری نے تو سب سامان فراہم ہی کر دیے تھے۔ اماں اگر روشنی پاس نہ ہوتی تو تم ہی کہو کہ یہ پولیس والے صبح ضمانت لینے سے پہلے گھر کب جانے دیتے خاص کر ہمارے ہمراہی اکثر مشکوک اور مشتبہ قسم کے ہوا ہی کرتے ہیں، لہذا آپ یوں سمجھ لیجیے کہ عالمگیر کا سالانہ نمبر اس طرح دست بدست دوستوں میں گیا گھوما تھا۔ اصل میں ہمیں کوتوالی پہونچانے والا تھا اور صاحب خدا کسی کو رات کے وقت بھی کوتوالی لے ہی نہ جائے کیونکہ عام طور پر کوتوالیوں کے مچھر اور سانپ بچھو مشہور ہیں ادھر ہماری حیثیت عرفی تیس کم سو روپیہ سے زیادہ نہیں۔ بارے خدا کا شکر ہے کہ ہم گیارہ دن کے بعد عالمگیر کو دیکھنے کے قابل یوں ہوئے کہ کوئی ایک بجے گھر پہونچے تو کہیں کے رئیس اور صدر بلدیہ تو تھے نہیں جو دروازہ پر سپاہی چپراسی یا خدام ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے اور اسی لیے تو یہ دفاتر کے ملازمین بھی کہدیا کرتے ہیں کہ۔ ملا صاحب مضمون نگاری اور چیز ہے اور دفتر کا کام

اور سو جانے

اور ہے۔ گویا ایک مضمون نگار میں فقط روٹی کھانے

ہی کی صلاحیت ہوا کرتی ہے اور بس، ہاں تو اب ایک بجے شب

کے گھر پہونچے تو نام خدا وہ تو سو رہی تھیں۔ جوانی کی نیند اس لیے

جو جناب نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا ہے تو تقریباً محلے کے کوئی

پانچ دس آدمی اپنی اپنی چارپائی سے گردنیں اُٹھا اُٹھا کر رہ گئے ہے

ہوں گے مگر نہیں سنا تو ننھے میاں کی والدہ نے تنگ آکر دروازہ کے

اندر ہاتھ ڈال کر چاہا کہ کنڈی کھول لیں تو خدا کا شکر ہے کہ ہاتھ ڈالا

تو یوں پھنس گیا کہ نہ باہر آتا نہ اندر جاتا تھا اور اب ہاتھ کی رگوں کا

یہ حال کہ بس بُرا حال، اب یہی اور رہ گیا تھا کہ ہم دوسرے ہاتھ

سے اپنا گلا گھونٹ لیتے کہ اندر سے ایک مری ہوئی سی آواز آئی کہ

کون ہے؟

اس پر ہم نے جو جواب دیا بس اُن کا بھی دل ہی جانتا ہوگا

مگر اتنا ضرور ہوا کہ دروازہ پر آگئیں آخر کو جناب شوہر پھر شوہر ہی ہوتا

ہے لاکھ وہ رات کے ایک بجے آئے یا دن کے تیرہ بجے، پس اندر

جاتے ہی واللہ بات تک نہ کی اور عالمگیر کو رکھ لیمپ کے سامنے جو

پڑھنا شروع کیا تو آدھے سے زیادہ پڑھ ڈالا اس وقت سالانہ نمبر کی

عنفائی اور رعنائی کا یہ عالم تھا کہ اس دست بدست گردش سے

صفحہ اول مل ملا کر ہو گیا تھا کہ کوئی تین آنے گز والا ململ، پیشانی پر کسی کے گھر کی سیاہی کے نشان بنے ہوئے تھے تو کسی غزل کے کسی شعر پر کسی دوست نے کوئی اعتراض لکھ رہا تھا، کسی نظم کے اشعار پر پسندیدگی کے صاد بنے ہوئے تھے اور کوئی تصویر ہے سے نمارد تھی۔ تو کہیں پان کے سرخ نشانات نے صفحات کی سفیدی کو تباہ کر دیا تھا، اور جلد کی ترتیب سے تو ایک ورق بھی اپنی جگہ پر درست نہ تھا بارے جس طرح ہو سکا اسے پڑھ لیا اور آج تیرہ دن کے بعد یہ رائے لکھنے بیٹھے ہیں:-

یہ ہے وہ دست بدست عنایت کا نتیجہ، تو یہ حالت ہے اُن کی جو خود کو دوست، مہذب، تعلیم یافتہ۔ روشن خیال۔ بیدار مغز شاعر۔ اہلِ قلم اخبار نویس اور خدا جانے کیا کیا سمجھے ہوئے دن رات گذارتے ہیں تو پھر کم علم طبقہ میں اخبار بینی اور رسالہ بینی کا جو حال ہوگا یا ہو سکتا ہے اُس کا اندازہ اب بہت آسان ہے اسی لیے تو ابتک طلسم ہوشربا، اور گوہر جان کی ٹھمری والی کتابوں سے لوگوں کو دلچسپی باقی ہے، اور پھر ہیں کہ سائمن کمیشن صاحب سے کہتے ہیں گو گو بیک، اماں پہلے اپنی جماعتی حالت کو تو ذمہ داری کی حیثیت دو جس جماعت میں وقت اور ذمہ داری کا کوئی احساس نہ ہو، جو

عہد و پیمان اور وقت کے پابند نہ ہوں وہ دنیا میں امان اللہ ہو کر بھی بچہ سقہ سے بدل جایا کرتے ہیں۔

زبان اردو کے اس دور میں جبکہ وہ علم و ادب، سیاست، تجارت اور بین الاقوامی لحاظ سے شباب پا رہی ہے اور ایسا شباب جو اُسے اُن ادیبوں کے دور میں بھی نصیب نہ ہوا تھا جن کی سوانح عمریوں اور جن کی انشا پردازی پر آج کل کے چند تہی مغز رسالے مضامین کے مقابلے شائع کر کے فرسودہ انسانوں سے عہد حاضر کے ناظرین کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ پھر زبان اُردو آج جبکہ محض اپنی وسعت اور بین الاقوامی صلاحیت کے باعث ہندوستان سے ماورائی بھی جا رہی ہے ایسے رسالوں کا جاری ہونا جیسا کہ رسالہ عالمگیر یا اُس کا سالانہ نمبر بابتہ ماہ جون ۱۹۲۹ء ہے از بسکہ مفید و ضروری ہے یہ سالانہ نمبر جس طرح نظری اعتبار سے بے حد دل آویز اور دل کشا ہے معنوی لحاظ سے بھی اُتنا ہی بلند ہے۔ اُس کے مضامین، تصاویر، طباعت جدولیں، نقش و نگار، کاغذ کی صفائی، مضبوطی، اور چھپائی کا حسن غرض ہر چیز اس درجہ دلکش ہے کہ یہ سالانہ نمبر کسی ایک خریدار کے پاس دوستوں سے محفوظ ہی نہیں رہ سکتا۔ وہ جو علی گڈھ والے

کہا کرتے ہیں کہ زبان انگریزی میں جیسے بلند رسالے شائع ہوتے ہیں دنیا کی کسی زبان میں شائع ہو ہی نہیں سکتے۔ تو کوئی ان ملکی چیزوں سے نفرت کر کے غلام ذہنیت اختیار کرنے والوں کو "عالمگیر" کا یہ سالانہ نمبر دکھا دے۔ تو بس اعتراض کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ جائیگا اور اسی دن سے عالمگیر کے سالانہ خریدار ہو کر رہ جائیں گے۔ بڑی چیز رسالے کے مضامین میں تنوع اور مضامین کی کثرت ہے۔ سو اس لحاظ سے عالمگیر کے سالانہ نمبر کے صفحات مضامین کی تعداد ۱۹۲ ہے اور اس سے زیادہ صفحات کسی طلسم ہوشربا کے تو ہو سکتے ہیں مگر اردو کسی رسالے کے نہیں۔ پھر مضامین پر علمی۔ اثری۔ ادبی تاریخی اور تحریری، تصاویر۔ بلند مقصد نظموں، شائستہ مذاق غزلوں" اور تخیلی تصویروں پر تخیلی نظموں کا اضافہ ایک ایسا دلفریب حسن ہے جو رسالے کے مضامین کی خشکی کو یوں دور کر دیتا ہے جس طرح اینچوہال کے عربی داں حضرات سے خدا نے ظرافت اور لطافت پسندی کے ملکہ کو چھین لیا ہے۔ تصویری تنوع کا یہ عالم ہے کہ انتہائی بڑھاپے کے نمونہ میں جہاں حضرت شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کی عجیب العجیب تصویر دی گئی ہے وہاں کم عمری کی تمام لطافتیں میاں سید احمد اللہ قادری طولعمرہ۔ کی تصویر میں فراہم نظر آتی ہیں۔ مضامین

ہیں جو حق تحقیق ادا کیا ہے وہ فقط دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ادبی نقطہ نظر جس قدر بلند رکھا گیا ہے۔ اس میں حضرت حکیم عمر خیام کو ایک ایسی دنیائے شباب و جمال کے ساتھ شراب پینا دکھایا گیا ہے جسے عرف عام میں "عورت ذات" کہتے ہیں۔ حقیقت میں خیال و گمان کی جو نزاکتیں اس تصویر میں جمع کی گئی ہیں اس میں دنیا کی شاعری ختم ہو جائے تو غلط نہیں۔ کاش اس تصویر کی فراغتیں بغیر شراب ہی کے اگر اپنے ملّا رموزی صاحب کو مل جائیں تو پھر ملّا رموزی صاحب بھی ثابت ہی کر دیں کہ دنیا میں فقط ایک ہی عمر خیام کو پیدا ہونے کا حق نہیں تھا، مگر یہاں اپنے ملا رموزی صاحب ننھے میاں کی جس جاہل اور تاریک تربیت والی والدہ میں بند کر دیے گئے ہیں۔ اُس کا جواب بھی ساری صنف لطیف پیش کرنے سے قاصر ہے۔

چند مشاہیر کی قلمی تحریروں کے عکس کو "چھاپ کر" عالمگیر نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ زبان اردو میں ہر قسم کی ترقی پذیر اہلیت کو دکھانے کے لیے روپیہ کی کافی مقدار بھی قربان کرتا ہے۔ عالم اس سے کہ اس سے بلند پایہ پرچے کی ساری کاپیاں خریدی جائیں یا بے دماغ ہندوستانی قصہ گل بکاؤلی اور اخبار پائنیر ہی خریدنے

رہیں، سب سے آخر خوبی یہ ہے کہ اس کے صفحۂ اول پر افغانی ٹوپی کے متعلق ہماری رائے درج ہے اور اندر ایک تازہ مضمون ہے جو ہر گھر کے طالب علم اور اُس کے باوا کے پڑھنے کے قابل ہے۔ پس بر بنائے حالات مذکورہ ہم "عالمگیر" کے ایڈیٹر صاحب کو کوئی مشورہ دے سکتے ہیں تو فقط یہ کہ آئندہ آپ رسالہ میں ہندو بھائیوں کے مضامین بھی شائع فرمانے کی کوشش کیجیے۔ یہ سب کچھ اس لیے لکھا کہ اخبارات اردو میں چونکہ اپنی ذمہ داری کے احساس کا وہی فقدان موجود ہے جو ہمارے مذکورۂ بالا دوستوں میں پایا گیا اس لیے امید نہیں تھی کہ یہ اخبار ایسے جلیل العظمت رسالوں کا خیر مقدم کریں گے پھر عالمگیر ایسا جمیل پرچہ تو اخباروں کے دفتر میں کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

پس اگر ان تمام خوبیوں کے اعتبار پر ہندوستانیوں نے اس رسالہ کو مبلغ ایک روپیہ میں خرید لیا تو ہم مان لیں گے کہ وہ سوراج بھی لے سکتے ہیں۔ فقط۔

عید کے بعد

عید کے ایک معنی تو یہ ہیں خوشی مثلاً علی گڈھ والوں کی عید کہتے ہیں اُسے کہ کوئی علی گڈھ کی ٹیم کے میچ ہیں یا ٹورنامنٹ جیت جائے اس طرح کہ کپ بھی اُسے مل جائے ۔ عام طلبہ کی عید ہوتی ہے اسکول کی چھٹی ۔ لیڈروں کی عید ہوتی ہے جب کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی قوم سے غداری کر کے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے صدر بن جائیں یا بن جانے کے قریب پہنچ جائیں یا اُنہیں امید ہو جائے کہ آئندہ سال وہ ضرور صدر بن جائیں گے بڑے مولوی صاحب کی عید ہوتی ہے اُس دن جب اُنہیں محلہ کے کسی امیر آدمی کے ہاں سے ماحضر تناول فرمانے کا اذن آجائے ۔ دفتری ملازموں کی عید ہوتی ہے جب کہ اُن کی تنخواہ میں اضافہ ہو جائے ۔ تانگے والوں کی عید ہوتی ہے جب کہ اُنہیں

ایک کے اوپر ایک ہوکر بیٹھنے والی سواریاں اتنی تعداد میں مل جائیں کہ گھوڑے کا سانس اُکھڑ جائے۔ قلی مزدوروں اور موٹرلاری کے ڈرائیوروں کے لیے مسافروں کی کثرت رئیسوں کے لیے ان کے گھوڑ دوڑ میں اُن کے گھوڑے کا سب سے آگے آجانا۔ مالکان رسائل کے لیے اُن کے "عید نمبر" کا بالکل فروخت ہوجانا۔

ہم نے عید نمبر کے لیئے عنوان رکھا ہے "عید کے بعد" تاکہ اس میں جو کچھ لکھیں وہ ایسا ہو کہ عید کے اول بھی کام آئے اور عید کے بعد بھی۔

پس واضح ہو کہ عید کے بعد کہتے ہیں اُس وقت کو جب عیدگاہ میں امام صاحب نماز کے خاتمہ پر بائیں طرف منہ کر کے کہیں۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ اور اب مسلمانوں کے وہ تمام خیالات بدلنا شروع ہوجاتے ہیں کہ جو سارے رمضان شریف میں اُن کے دماغوں میں آنے والی عید کے لیے بھرے رہتے ہیں۔ بس سلام کے بعد جو دعا مانگی جاتی ہے اُسی دعا میں ۹۵ فی صدی مسلمان کہتے ہوں گے کہ "اللہ میاں یہ رمضان اور عید کا قرض جلد ادا

کر دینا"، کیونکہ تو ہر حالت میں غالب و قادر خدا ہے۔ گو کہنے کو
عید گاہ سے معانقے جوشیلے مصافحے اور پر مسرت سلام اور
مبارکباد کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں مگر کتنے مسلمان ہوتے ہیں
جو عید گاہ ہی سے اپنے بچوں سے کہنا شروع کر دیتے ہیں:۔

ابے دیکھ مردود شیروانی پر داغ لگ گیا۔

تو ذرا سنبھال کر پہن۔

تو وہ بفر عید پر اب ایک اور نئی شیروانی کہاں سے

لاؤں گا؟۔

لاحول ولا ارے بیٹے ذرا دیکھو تو اپنی قمیص کا یہ دامن

تھوک سے خراب کر لیا تم نے"

تھو کو تھو کو پان اگر ایسے ہی پان کھاؤ گے تو پھر ہم تو

بنا چکے اتنی قمیضیں تمہاری"

استغفر اللہ اور وہ جو ابھی عید گاہ میں میں نے تمھیں

اٹھنی دی تھی وہ آخر کہاں کھو دی۔

تو نالائق تو نے مجھ سے وہیں کیوں نہ کہا۔

ابے اب کوئی تیرا خادم بیٹھا ہے وہاں جو تیری اٹھنی

اُٹھا لائے گا اور دے دے گا تجھے کہ لو میاں یہ آپ کی اٹھنی"

تجھے کیا خبر کہ پیسہ کس طرح کماتے ہیں۔

چلو چلو بس لے لی مٹھائی۔ یہاں تو فقط اب یہ چار آنے پڑے ہیں جیب میں، اور ابھی گھر میں خدا جانے کیا ضرورت پیش آجائے۔؟

تو بس اتنے کھلونے کافی ہیں۔ کیا کھلونوں کو کھاؤ گے جو یہ گاڑی بھر کھلونے خرید رہے ہو؟۔

کوئی تین دن بھی عید کے بعد نہیں گزرتے ہوں گے کہ غریبوں کے گھروں میں عید کے کپڑے تہ کر کے صندوقوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اور ہر گھر میں قرض کے ادا کرنے کی ترکیبیں سوچی جانے لگتی ہیں، اور وہ تمام قالین، کرسیاں میزیں، آئینے اور گدے تکئے، سنبھال کر رکھ دیے جاتے ہیں جو عید کی نمائش کے لیے بڑے اہتمام سے لائے جاتے ہیں اور لگائے جاتے ہیں۔

مجاہد عبدالہادی انصاری ہمارے اُن دوستوں میں سے ایک ہیں جنہیں جہد و جہاد اور مذہب و احکام مذہب سے وہ غائبانہ شیفتگی ہے جو کبھی عہد سعادت یا عہد حکومت اسلامی

کے دور میں مسلمانوں میں دیکھی اور سُنی گئی ہے اور اسی غازیانہ جذبہ کی نسبت سے انکا نام بھی مجاہد عبدالہادی واقع ہوا ہے۔

وہ جو کہا ہے کہ انسان کا شیطان انسان ہوتا ہے سو اس مثل کے خلاف مجاہد عبدالہادی اور نہیں تو رمضان شریف کے الوداع والے جمعہ کے دن سے عید کے بعد تک ملا رموزی صاحب کے حق میں ایک قسم کے مذہبی کو توال صاحب ضرور بن جاتے ہیں یوں کہنے کو علی گڈھ والوں کو لفظ "اسلام،، کا جتنا درد ہے اور مذہب کی خدمت کے لیے جتنا علی گڈھ کا آدمی کام کرتا ہے شاید ہی ہندوستان میں کوئی دوسرا مسلمان اس درجہ جوشیلا مذہبی نظر آئے۔ مگر سوائے مولینا ظفر علی خاں۔ حسرت موہانی اور محمد علی۔ شوکت علی، کے دوسرے بے شمار علی گڈھیوں نے۔ خلافت ایجی ٹیشن، نیشنل کانگریس کی کامل آزادی والی قرارداد، ترک موالات کی تعمیل، مسلم یونیورسٹی کی مسجد میں نماز با جماعت۔ کھدر کے استعمال، کم سے کم رتبہ مسلمانوں سے دوستی اور برادری سے لیکر رمضان شریف تک میں جو کچھ بھی کیا یا کرتے ہیں وہ ساری دنیا پر ظاہر ہے۔ اماں صاف کہتے ہیں کہ یہ علی گڈھیئے اپنے اپنے مقام سکونت میں

سارے رمضان بیٹھے فرنگیوں کے چرٹ عرف سگار اور سگریٹ پیا کرتے ہیں رہی نماز کی پابندی تو وہ یونیورسٹی کی مسجد تک میں نہیں پڑھتے تو پھر کہیں کے افسر اور کلکٹر ہو کر کیا پڑھیں گے ہاں پاینیر اخبار کی تلاوت کے بڑے پابند ہیں۔ اور مکانوں پہ کتّے پالنے کے بعد بے حد مداح مگر اللہ بچائے یا نہ بچائے مجاہد عبدالہادی انصاری سے کہ جہاں رمضان شریف کا پہلا چاند نظر آیا اور یہ خدا جانے کہاں سے اور کس طرح تمام دنیوی کاموں سے فارغ ہو کر یوں مسلط ہوتے ہیں کہ عید کے بعد بھی تھوڑے روزے رکھوائے بغیر باز نہیں آتے۔ شعبان کے چودھویں رات سے یکم رمضان تک ان کا ساتھ جس طرح گزرتا ہے اس کی تفصیل یوں ہے:۔ کہ

کہو اس مرتبہ کے رمضان میں بھی روزے رکھو گے یا نہیں ؟۔

اماں شرم تو آتی نہیں ، خدا کے کاموں میں ہو کہ صحت کی خرابی کو لیئے پھرتے ہو۔ آخر آخرت میں کیا جواب دو گے خدا کو ؟

اور ہاں قرآن شریف کس مسجد میں سناؤ گے ؟۔

کیا کہا ؟
لاحول ولا استغفر اللہ۔ اور اس پر بنے پھرتے ہیں پھر
ملا رموزی ؟۔
تو پھر یہ خدا کے بندوں کو دھوکہ دینا ہوا مسلمان
کا ہے کا ہے ؟۔
استغفر اللہ تو یہ کون کہتا ہے کہ تم بارہ مہینے روزے
رکھو مگر یہ تو وہ زبردست فرض ہے کہ کسی حال میں ٹالا نہیں
جا سکتا۔
بس تو پھر اس مرتبہ تین قرآن شریف سنانا۔
انا للہ اماں یہ تمہارے حالات تو نیچری لوگوں کے سے
معلوم ہوتے ہیں۔
تو مگر یہ مضامین تمہیں بخشوا دیں گے کیا ۔ ؟
مگر وہ تو میں تیرہ برس سے نہار اہی قرآن شریف سُن
رہا ہوں اب کسی دوسری مسجد میں لوگ مجھے دیکھ کر کیا کہیں گے؟
اماں گرمی کیسی ؟ ۔
اور وہ تو سوچو کہ صحابۂ کرام کیسے آگ برستے ہوئے میدانوں
میں جہاد کرتے تھے ۔ اور روزے بھی رکھتے تھے۔

اور تم خود بھی تو کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ صحابۂ کرام کے طریقوں، اُن کے اخلاق و عادات اور اُن کے ہر عمل کی تقلید کریں تو پھر یہ خود را فضیحت اور دیگراں را نصیحت کیسی؟۔

رمضان شروع ہوئے اور اب الوداع کا جمعہ بھی گزر گیا تو مجاہد عبد الہادی کی پریشانی کا عالم یہ کہ ہر شام کے وقت سارے شہر کی غلط کاریوں کی رپورٹ جنّت میں پیش نہ کردیں تو کھانے کے ہضم میں فتور آجائے۔

تو دیکھا آج وہ شوکت علی خاں "سپرنٹنڈنٹ"، ملا صاحب آپ نے؟۔

اماں غضب خدا کا اُس نے آج جو عید کا کپڑا خریدا ہے تو میں کیا کہوں تم سے۔؟

لے گیا ہوگا کوئی ہزار سوا ہزار کا کپڑا، مگر اُس آنکھوں کے اندھے کو نہ سوجھا کہ میں کیا کر رہا ہوں، اماں کہا کیوں نہیں ہر طرح سمجھایا کہ دیکھو بھائی یہ انگریزی کپڑا ہے اور پھر ایک سے ایک بڑھیا۔ قسم کا اوّل تو شرعاً حرام ہے۔ پھر یہ کہ تجھے اگر اتنا ہی لینا ہے تو لے۔ مگر خدا کے لیئے تو کسی مسلمان کی دُکان سے لے، اور

جو عید کے سامان کے لیے تجھے مسلمانوں کی دُکان سے خریدنا

ایسا ہی ناپسند ہے تو پھر تو دیسی سامان تو خرید بندے خدا کے،

اور پھر یہ عورتوں کے لیے جو تو پمپ جوتے خرید رہا ہے۔ تو اول

تو یہ کہ اس سے عورتوں میں نمود و نمائش اور فضول خرچی کی

عادت ترقی پکڑے گی۔ پھر جب بچے اپنی ماں بہنوں کو یوں پمپ

جوتوں میں غرق پائیں گے تو وہ بھی پھر سائیکل اور موٹر سائیکل

کے طالب ہوں گے کل کو " اور یہ جو آج کل اسکولوں کے لمڈے

بغیر کوٹ۔ پتلون۔ جاکٹ۔ باس کٹ۔ اور سر میں انگریزی

تیل ڈالے بغیر اسکول ہی نہیں جاتے تو اس لیے کہ وہ گھر میں جب

اپنے ماں باپ کو پمپ جوتا پہنے، موٹر کار میں سیر کو جاتا دیکھتے

رہتے ہیں تو پھر ایسوں کی اولاد ہیں۔

مذہبی احکام کی تعمیل کفایت شعاری کا خیال اور دیسی چیزوں

سے محبت پیدا ہو تو کس طرح ؟۔

تو کیا غلط کہہ رہا ہوں ملّا صاحب۔

اچھا ان سیرون صاحب کو بھی جانے دیجیئے۔ بھاڑ میں

وہ اس ابراہیم علی حلوائی کی حرکت بھی معلوم ہوئی آپ کو

اماں عجیب جاہل انسان واقع ہوا ہے کہیں کا۔

تم جانتے ہو کہ اس شہر میں لے دے کے صرف یہی ایک مسلمان حلوائی ہے۔ مگر یہاں عید کی نماز سے واپس آیا اور اس نے دکان بند کر کے جو گشت شروع کیا تو خدا جانے کہاں کہاں مارا پھرتا ہے اور مسلمان ہیں کہ ہندوؤں کی دوکانوں سے ہزاروں پیسہ کی مٹھائی خریدنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔

خدا جانے ان مسلمانوں کو دولت کمانا کب آئیگا۔

اور میں نے اس کی داڑھی سے ہاتھ لگا کر سمجھایا کہ دیکھ ابراہیم علی بس ایک تو ہی ہمارے شہر کا مسلمان حلوائی ہے۔ خدا کے لیئے تو عید کے بعد اپنی دوکان کھولا کر کہ اس میں تیرا بھی نفع ہے اور مسلمان بھی مسلمانوں سے سودا خریدنے کے عادی ہو جائیں گے۔

کہنے تو لگا کہ ہاں مولانا صاحب میں آپ کی نصیحت پہ عمل کرونگا مگر آپ دیکھ لیجیے گا ملا صاحب کہ وہ ہرگز دوکان نہ کھولے گا۔ اور ملا صاحب ایمان کی تو یوں ہے کہ ایک نے چارے ابراہیم علی سے کیا شکایت یہ آپ کے دوسرے مسلمان تاجر، دوکان دار، اور سودا سلف والے عید کے دن دکانیں کب کھولتے ہیں، ان میں کا ایک ایک مارا پھرتا ہے۔ عید کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا، اور دوسری قوموں کے دکاندار ہوتے ہیں کہ اپنی بے خبر اور جاہل عید منانے والے مسلمانوں سے

عید کے موقع پر سال بھر کی دولت وصول کر لیتے ہیں۔ اور پھر کہا یوں جاتا ہے کہ مسلمان دنیا کی سب سے ذلیل، جاہل، مفلس، اور تنگدست قوم ہے، تو پھر ذلیل نہ ہو تو کیا ہو، غرض ملا صاحب ان عید منانے والے مسلمانوں کی بے اعتدالیوں ان کی فضول خرچیوں اور ان کی بدمستیوں سے میں تو یوں عاجز آ گیا ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا" اور تماشہ دیکھئے کہ یہ مسلمانوں کے اسکولوں میں پڑھنے والے "لمڈے" تو واللہ عید کے موقع پر اپنے ماں باپ کی دولت یوں تباہ کرتے ہیں کہ بھئی واللہ دیکھا نہیں جاتا" اماں غضب خدا کا ان میں کا ایک لونڈا۔ انگریزی موزے، بنیائن، مفلر، ٹائی، کالر، ولایتی جوتے لونڈر۔ پوڈر۔ اور انگریزی کھلونے اس قدر کثیر مقدار میں خریدتا ہے کہ خدا جانے صرف ایک عید پر کئی کروڑ روپیہ ہندوستان کے سارے مسلمانوں کی جیب سے نکلکر یوروپ والوں کے گھر پہونچتا ہوگا۔

بے شک ملا صاحب سچ فرماتے ہیں آپ کہ ان بیچارے کم سمجھ نادان لونڈوں کی کیا خطا ہے اصل میں خطا تو ہے اُن غلام ہندوستانی ماسٹروں اور پروفیسروں کی جو اسکولوں اور کالجوں میں ان بچوں کے سامنے بس انگریز بنے پھرتے ہیں۔ ہاں اگر یہ غلام دماغ

ہندوستانی ماسٹر اور پروفیسر اپنا ملکی اور قومی لباس پہنکر اسکول جائیں اور سارے طلبہ کو دیسی لباس اور دیسی باتیں پسند کرنے کی ہدایت کرتے رہیں تو پھر کیا مجال جو بچوں میں کفایت شعاری اور جفاکشی کے جذبات بیدار نہوں ۔

ملّا رموزی کے دوست کی عید نو اور ملاحظہ فرمالی ۔ آپ نے کہ ممدوح گرامی کو کسی کل چین ہی نصیب نہ ہوا ۔ اور عید کے موقعہ پر آپ مسلمانوں کے فضولیوں ہی پر غم و غصّے اور انتظام میں صرف ہوگئے لیکن ملا رموزی کی عید کا عالم اس سے بھی زیادہ نرالا ہے ۔ چنانچہ ہمارے ننھے میاں کی تازہ والدہ الوداع کا جمعہ تو بہت دور کوئی دس بارہ رمضان سے پہلے ہی ایک دن فرمانے لگیں کہ بس اب عید میں رہا کیا ۔ آج ہی کے دن عید ہو بھی چکی ہوگی ۔

اس کا مطلب صاف یہ تھا کہ عید میں بہت کم دن باقی ہیں اور تم ہو کہ اب تک مجھ سے یہ بھی دریافت نہیں کرتے کہ تمہیں کن چیزوں کی ضرورت ہے ۔ ؟

ہوتے ہوتے کوئی بیس رمضان کو یکایک وہ بولیں کہ ابھی سے کہے دیتی ہوں کہ میں عید پر اماں بی کے ہاں نہ جاؤں گی ورنہ عین

موقع پر کہو کہ کیوں نہیں جاتی ہو؟ اب تو لامحالہ دریافت کرنا ہی پڑا کہ کیوں؟ بس ہمارے منہ سے "کیوں" کا نکلنا تھا کہ بولیں:-

کیوں کیسی؟

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس مرتبہ عید کے لیے اماں جان کے ہاں خالو میاں اور خالہ جان بھی کلکتہ سے آ رہی ہیں، اور پھر محلے کی دس پانچ ماں بہنیں بھی آخر جمع ہو ہی جاتی ہیں تو ان سب میں میں کس منہ سے بیٹھوں گی؟ یہ دیکھیے نا آخر کہ میرے پاس یہ جوتا ہے تم ہی کہو کہ کب کا ہے اب اگر عید کے موقع پر نیا جوتا بھی نہ ہوا تو پھر عید کیا ہوئی بچوں کا کھیل ہو گئی۔

اب تک پاجاموں اور قمیصوں کا کپڑا نہیں آیا ہے تو پھر کیا عین عید کے دن آئیگا۔؟

ہیں تو قیامت تک دیسی کپڑے کی قمیص نہ پہنوں گی۔

تو کیا اسی دن کے لیے بنے تھے آپ ملا رموزی۔

تو اگر ایسا ہی مجھے دیسی لباس پہنانا تھا تو ابتدا ہی میں کہہ دیا ہوتا مجھ سے۔

خدا کا شکر ہے میرے باپ نے تو مجھے ہمیشہ ریشم ہی پہنایا ہے اور آج کہو تو میرے ماں باپ میرے کپڑے بنا کر بنا دیں تم کو

جی نہیں میرا بدن کوئی لوہے اور فولاد کا تو ہے نہیں جو ان موٹے کپڑوں کو برداشت کر سکے۔ یہ تو آپ ہی کو مبارک رہیں۔

ہاں ہاں تو میں کب کہتی ہوں کہ آپ چوری کر کے عید کے کپڑے لائیں۔

تو پھر ناحق کو تم نے مجھ سے چھپایا ڈرکس کا تھا، کہہ دیا ہوتا پہلے ہی کہ مجھے کوئی قرض نہیں دیتا، بس تو رہنے دیجیے مجھے عید ہی نہیں کرنا وغیرہ۔

اس قسم کی جرح اور گفتگو الوداع کے جمعہ تک ہوئی ہر یا مسلمان عورتوں میں ہوتی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہی نکلتا دیکھا گیا ہے کہ ملا رموزی صاحب گئے بازار ناؤ میں اور لے آئے اتنا سامان قرض کہ محرم کے بعد تک اس کا روپیہ ادا نہ ہو سکا۔ اور جب عید کے بعد بھی کوئی ان کے سامنے عید کا نام لیتا تو جی چاہتا کہ یہ شخص بات ہی نہ کرے۔

اس لیے عرض ہے کہ جن لوگوں کو اس عید پہ نہیں تو آنے والی بقر عید پہ تو از راہِ خدا۔ ان باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اُن کا، اور اُن کے

بچوں کا ، اور اُن کی عورتوں کا لباس حد سے زیادہ
سادہ ہو۔ مگر دل و دماغ عید کی خوشی سے مالامال
ہوں کہ عید کا اصل مقصد دل کی خوشی اور قومی کاموں
کی اصلاح ہے اور بس ۔

ختم شد

غنچۂ تبسّم

مشہور انشاء پرداز اور ادیب حضرت تمکینؔ کاظمی کے مزاحیہ
مضامین کا مجموعہ جسکا روح پرور دیباچہ حضرت ملا رموزی نے لکھا ہے۔
لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ نفیس سرورق رنگین مصور قیمت (۱عہ)

تذکرۂ ریختی

ریختی گو شعراء کے حالات زندگی اور اُن کے کلام کا عمدہ ترین انتخاب
ریختی پر ایک فاضلانہ مقدمہ اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ ہے۔
لکھائی چھپائی نفیس کاغذ عمدہ سرورق رنگین قیمت (عہ)

ملنے کا پتہ

(۱) سید رشید کاظمی، دبیر پورہ
(۲) مکتبۂ ابراہیمیہ محمود
(۳) محمد علیم الدین تاجر کتب اسٹیشن روڈ

حیدر آباد
دکن

مطبوعۂ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر